٦- سابرمتی آشرم سے چرخہ کا چرچا شروع ہ



٧- وردھا میں سیواگرام آشرم ہے-



٨- نواکھالی میں بنگالیوں کو شانتی کا سبق پڑھا





٩- پٹنہ میں بہاریوں کو پریم کا سندیسہ دیا-



گاندھی بابا کی کہانی

اشوک کے نام

پیش لفظ

کوئی ایک سال ہوا قدسیہ زیدی نے مجھ سے اِس کتاب کے لئے جو بچّوں کے واسطے لکھی گئی ہے تمہید کے چند لفظ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ میں نے عذر کیا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے اور ایسی فرمائش پوری کرنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔ مگر وہ اصرار کرتی رہیں کہ دیر سویر سے کچھ لکھ ضرور دیجئے۔ میرے لئے انکار کرنا مشکل ہوتا گیا۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے یہ چھوٹی سی کتاب سچّے دل سے لکھی ہے، وہ اسے صرف ایک کتاب نہیں سمجھتی ہیں یہ بھی ظاہر تھا کہ اُن کے لئے گاندھی جی کی کہانی ایک بہت ہی اہم اور عزیز چیز ہے۔

اِس کتاب کا مسوّدہ میرے پاس ایک سال رہا۔ اسے دیکھ کر مجھے بار بار یاد آتا رہا کہ مجھ سے ایک فرمائش کی گئی ہے اور اُسے پورا کرنے میں مجھے تامل ہے۔ آخر کار میں اِس مسوّدے کو اپنے ساتھ سونامرگ لے گیا، جہاں سے کشمیر کے دریائے سندھ کی وادی شروع ہوتی ہے۔ وہاں اُونچے پہاڑوں اور برفانی وادیوں کی ہمسائگی میں بیٹھ کر میں

نے گاندھی جی کی کہانی کو پھر یاد کیا۔

مجھے آخر اس کے بارے میں کچھ لکھنے میں تامّل کیوں تھا؟ یہ بات میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی، بس اتنا جانتا ہوں کہ جب کبھی گاندھی جی کا خیال آتا ہے تو مجھے اپنی خامیاں اور کوتاہیاں بہت محسوس ہونے لگتی ہیں۔ گاندھی جی کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو رفتہ رفتہ یقین ہو جاتا ہے کہ اِس مضمون کا حق ادا نہ کر سکوں گا۔ ہم میں سے وہ لوگ جنھیں گاندھی جی کی شخصیت کے سائے میں رہنا اور پرورش پانا نصیب ہوا اور جنھوں نے اُن کی عظمت اور اُن کی اُس قوّت کے جلوے دیکھے ہیں جو طرح طرح سے ظاہر ہوئی تھی، وہ اپنی کیفیت دوسروں سے بیان نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں الگ اور ایسا گہرا اثر ہے کہ ہماری ساری زندگی اس کے رنگ میں رنگ گئی ہے۔ اب اس اثر کو، جسے اپنا ہی دِل جانتا ہے، بیان کیسے کیا جائے۔ جو لفظ لکھئے، روزمرّہ کا اور ادنیٰ معلوم ہوتا ہے، جو بات کہئے بے حقیقت لگتی ہے، اور طبیعت بے چین رہتی ہے کہ مطلب ادا نہیں ہو سکا۔

مگر پھر یہ بھی ہے کہ اس نسل کے لوگ جنھوں نے گاندھی جی کو دیکھا تھا، اُن کے پاؤں چھوئے تھے، اور اُن کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو سے واقف ہو گئے تھے گذر جائیں گے، بلکہ ہمارے سامنے گذرے جا رہے ہیں۔ گاندھی جی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کچھ یادگاریں رہ جائیں گی، کچھ تحریریں اور کتابیں، اور وہ روایتیں جو ہر قوم کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

گاندھی جی کو ہم سے جدا ہوئے ساڑھے چار سال ہو گئے ہیں۔ اب اُن کا مقام ہندوستان کی تاریخ ہی میں نہیں، اُس کی پُرانوں اور کتھاؤں میں ہے۔ وہ اُن عظیم الشان شخصیتوں میں شامل ہو گئے ہیں جو انسانیت کے راستے کو روشن کرنے، دِلوں میں شرافت کا نور اور انسانوں میں ایک نئی جان ڈالنے کے لئے نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

یہ مناسب ہے کہ ہمارے لڑکے اور پوتے اور پرپوتے بچپن ہی میں اُن کی کہانی کو سُنیں۔ اِس میں رزمیہ داستان کی سی کیفیت ہے، اور اگرچہ ہمارے بچّوں کو اب گاندھی جی کو جیتے جاگتے دیکھنا نصیب نہیں ہو سکتا، مگر انھیں گاندھی جی کی زندگی کے حالات اور اُن کی تعلیم کا کچھ گیان ہو جائے گا اور وہ اس قدیم ہندوستانیت کو بھی سمجھ سکیں گے جس کی ایک اعلیٰ مثال گاندھی جی کی شخصیت تھی اور اُس پیام کو سُن سکیں گے جو ہندوستان اپنے سنتوں اور صوفیوں کی زبانی پہنچاتا رہا ہے، اور جو گاندھی جی کا پیام تھا۔

مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب لکھی گئی اور مجھے امید ہے کہ یہ کامیاب ہو گی۔

نئی دہلی

یکم ستمبر ۱۹۵۲ء

جواہر لال نہرو

With Compliments
from
The
Indian Council
for
Cultural Relations

New Delhi. 1. 1953



گاندھی بابا کی کہانی

ہری اپنے گھر لوٹا تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ سارا گھر سُنسان ہے، نہ داداجی بیٹھے حُقّہ گڑگڑا رہے ہیں، نہ ماتاجی رسوئی میں روٹی بنا رہی ہیں۔ اِتنا سنّاٹا دیکھ کر ہری کو ڈر سا لگنے لگا۔ جب اُس نے اپنی ماتاجی کو اِدھر اُدھر ڈھونڈھا تو دیکھا کہ وہ ایک کونے میں بیٹھی رو رہی ہیں۔

ہری نے اِس سے پہلے اپنی ماں کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ اُنھیں بلکتے دیکھ کر اُس کا دِل بھر آیا اور وہ بھی رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے بھر آئی ہوئی آواز میں پوچھا "اماں! کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟" جب اُنھوں نے رُک رُک کر کہا "گا------گاندھی------------بابا------------مر گئے" تو ہری کا دِل دَھک سے رہ گیا۔ اُس نے کہا "اماں کیسے مر گئے گاندھی بابا میں تو کل ہی پتاجی کے ساتھ اُن کی پرارتھنا میں گیا تھا۔ جب میں نے جاکر اُن کے پاؤں

چھوئے تو اُنھوں نے بڑے پیار سے میرے گال کو چھو کر کہا 'کیوں جی! اب تو تم دنگا نہیں کرتے؟ اماں! کل تک تو بالکل اچھے تھے گاندھی بابا!' یہ سُن کر ہری کی ماں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ہری نے سسکیاں لیتے ہوئے پھر پوچھا: "اماں! وہ کیسے مر گئے؟"

ماں: "ہری! میں کیا بتاؤں کیسے مر گئے، کسی نیچ پاپی نے انھیں گولی ماردی"۔

ہری: "ماتا جی! بھلا اس کا گاندھی بابا نے کیا بگاڑا تھا؟ وہ تو اتنے اچھے تھے کہ اُتنے اچھے تو دادا بھی نہیں"

ماں: "ہاں! بیٹا، یہ ایسی ہی دنیا ہے، یہاں سچ بولنے والے اور بھگوان کے بھگت بُرے لوگوں کو نہیں بھاتے۔ سچّی بات سدا کڑوی لگتی ہے۔ بیٹا! لوگ اُسے سُننے کو تیّار نہیں ہوتے"

"اماں! آپ مجھے پتا جی کی بندوق دے دیں، میں ابھی اُس پاپی کو جان سے مار ڈالوں گا جس نے ہمارے گاندھی بابا کو ہم سے چھین لیا"۔ ہری جوش میں آکر بولا۔

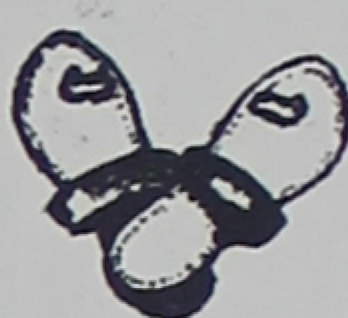
ماں: "نہیں ہری! یہ بُری بات ہے۔ گاندھی بابا نے ہمیں یہی تو سکھایا ہے کہ کسی کی جان لینا پاپ ہے۔ تم نے صرف اُن کو دیکھا ہی دیکھا پہچانا نہیں۔ آؤ میں تم کو بتاؤں کہ وہ کون تھے۔ تمھیں بڑا اچنبھا ہوگا ہری! جب میں تمھیں یہ بتاؤں گی کہ گاندھی بابا بچپن میں بالکل تمھارے ہی جیسے لڑکے تھے، پر

اُنھوں نے اپنی اَتھک کوششوں سے اپنے آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ پریم اور سیوا کے بل وہ گوتم بُدھ کی طرح مہاتما بن گئے۔ وہ اِس دیس کے سب سے بڑے سیوک اور بے تاج کے بادشاہ تھے۔ وہ یہاں کے چالیس کروڑ باسیوں کے دِلوں پر راج کرتے تھے۔ اُن کے سامنے لوگ سر ہی نہیں جھکاتے تھے بلکہ اُن سے سچّے دل سے پریم بھی کرتے تھے۔ اِس دیس کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی اُنھیں اپنا باپ سمجھتا تھا اور سب اُنھیں باپو کہتے تھے، اس لئے کہ گاندھی بابا کا دل لوگوں کے دُکھ سے دُکھتا اور اُن کے سُکھ کے ساتھ سُکھی ہوتا تھا۔ وہ غریبوں سے بہت پریم کرتے تھے۔ اُن ہی کی طرح رہتے اور اُن ہی کی طرح کھدّر کی دھوتی باندھتے اور کھدّر کی ایک چادر اوڑھتے تھے۔ بکری کا دودھ پیتے اور اُبلی ہوئی ترکاریاں کھایا کرتے تھے۔ وہ ایک بڑے مہاتما تھے بیٹیا!"



ہری: "اماں! اور گاندھی بابا بچّوں سے کتنا پریم کرتے تھے! کبھی اُن کو ہنساتے، کبھی اُن سے اچھی اچھی باتیں کرتے، کبھی اُن کو ساتھ لے کر ٹہلنے جاتے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بھی ایک بچّہ ہیں۔ اماں! مجھے شروع سے گاندھی بابا کی کہانی سُنائیے"

ماں: "اچھا بیٹا! جو جو مجھے یاد آتا جائے گا سُناتی چلوں گی۔ آج رسوئی تو بنانی نہیں، کھانا کس سے کھایا جائے گا۔ تمھارے دادا جی پڑوس کے ایک گھر میں گئے ہیں کہ ریڈیو سے کچھ اور پتہ چلے۔ جب تک وہ آئیں تب تک میں تم کو باپو کا حال سُناتی ہوں، کہ اسی سے کچھ دل ہلکا ہو"





۱

ہری کی ماں نے باپو کی امر کہانی یوں شروع کی :-

"بمبئی سے اُتر کی طرف کاٹھیاواڑ کے ایک رجواڑے کا نام پور بندر ہے۔ وہاں اسی نام کی ایک بندرگاہ ہے۔ وہی اُس رجواڑے کی راجدھانی ہے۔ برسوں پہلے جب تمہارے داداجی تم سے بھی چھوٹے تھے۔ پوربندر میں ایک کرم چند گاندھی رہا کرتے تھے۔ وہ تھے تو ذات کے بنئے پر اُن کے کنبے میں لوگ اچھے پڑھے لکھے تھے۔ اِس گھرانے میں تین پیڑھیوں سے باپ کے بعد بیٹا کاٹھیاواڑ کے رجواڑوں میں دیوان ہوتا آیا تھا۔

"کرم چند بہت سچے، بہادر اور دانی تھے۔ لوگ اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُن کے کہنے کو پتھر کی لکیر مانتے۔ مزاج کے کچھ کڑوے تھے، اِس لئے لوگوں پر اُن کا بڑا رعب تھا۔ وہ کاٹھیاواڑ کے راجوں مہاراجوں کے جھگڑے نمٹایا کرتے تھے۔ سدا سچ بولنے اور کھری بات کہنے کی وجہ سے لوگ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

"کرم چند کئی سال پوربندر میں رہے۔ پھر وہاں کا حال بگڑنے پر راجکوٹ چلے

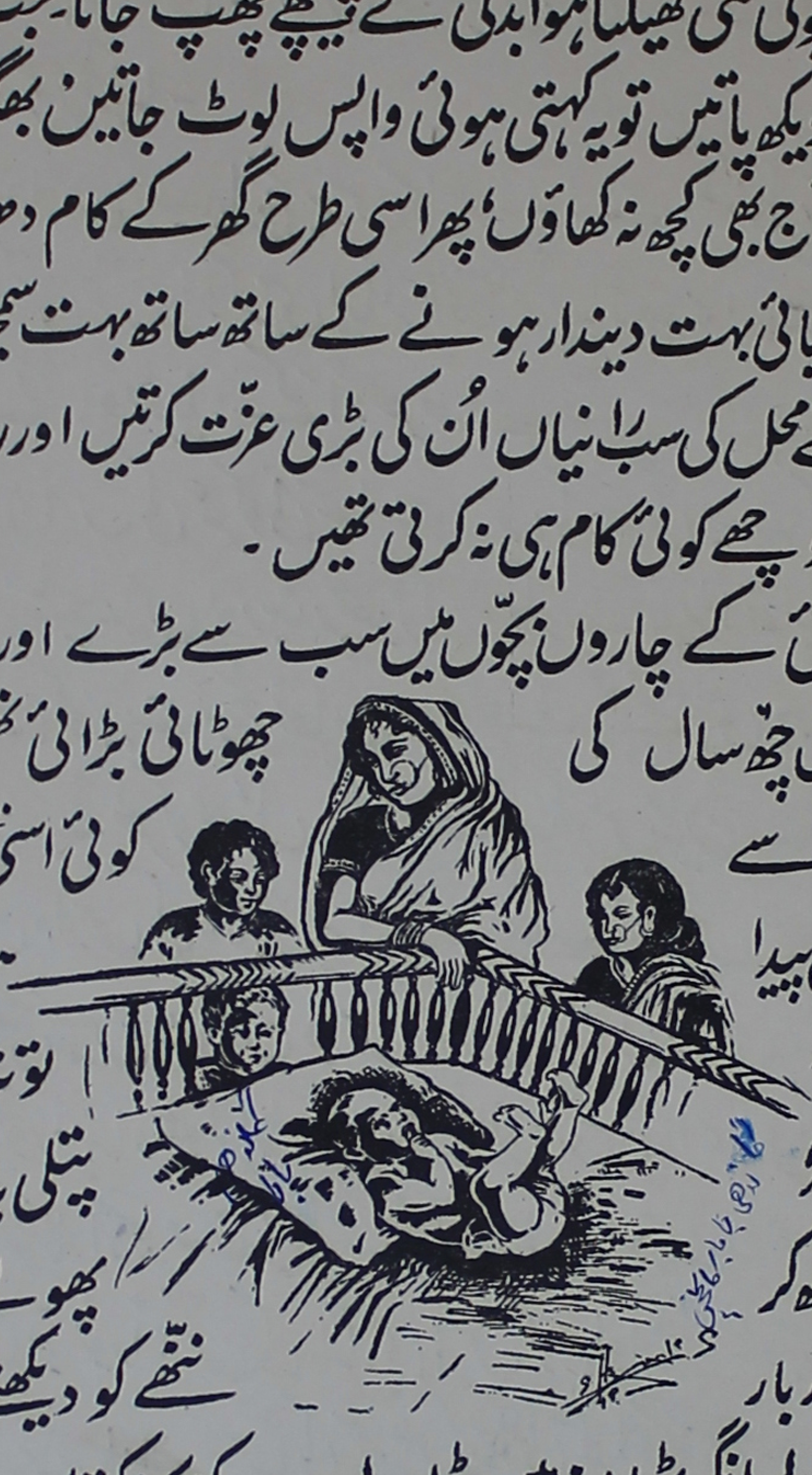
گئے۔ راجکوٹ بھی کاٹھیاواڑ کی ایک ریاست ہے۔ بیل گاڑی میں پوربند سے راجکوٹ جانے میں پانچ دن لگتے تھے۔ راجکوٹ کے راجہ جنھیں وہاں کے لوگ ٹھاکر صاحب کہتے ہیں کرم چند کو بہت مانتے تھے۔ کچھ برس میں ہی انھوں نے کرم چند کو اپنا دیوان بنالیا۔

"ایک مُعاملے میں بچارے کرم چند کا بھاگ بڑا کھوٹا تھا۔ اُنھوں نے ایک کے بعد ایک تین شادیاں کیں۔ پرایشور کی مرضی، تینوں بیویاں پرلوک سدھاریں۔ چالیس برس کی عمر میں اُنھوں نے چوتھی شادی پتلی بائی سے کی۔ اسے بھگوان نے ایک بیٹی اور تین بیٹے دئے۔

"کرم چند اور پتلی بائی اپنے دھرم میں پکّے اور بہت نیک تھے۔ دونوں روز مندر جاکر پوجا کرتے اور پھول چڑھاتے۔ کرم چند سے کہیں بڑھ کر پتلی بائی دھرم کی پابند تھیں۔ کوئی دن ایسا نہ تھا کہ جس دن وہ مندر نہ جاتیں۔ تہواروں پر برت رکھتیں۔ اگر کبھی بیمار ہو جاتیں تو بھی برت نہ چھوڑتیں۔ برت کے سلسلے میں وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بندھن لگا لیتیں۔ مثلاً برسات کے دنوں میں جب تک سُورج کو آنکھ سے نہ دیکھ لیتیں کھانا نہ کھاتیں۔ ہری! تم خود جانتے ہو برسات کے موسم میں سُورج کئی کئی دن تک بادلوں میں منہ چھپائے رہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کسی کام میں ہوتیں اور اُن کے بچّے آنگن میں کھڑے آسمان کی طرف آنکھ لگائے رہتے کہ کب سُورج بادلوں میں سے نکلے اور

کب وہ اپنی ماں کو بلا کر لائیں۔ جیسے ہی سورج کو دیکھتے بھاگے بھاگے جاتے اور ماں کو خبر کرتے۔ مگر اکثر ماں کے آتے آتے برسات کا چنچل سورج آنکھ مچولی سی کھیلتا ہوا بدلی کے پیچھے چھپ جاتا۔ جب وہ آتیں اور سورج کو نہ دیکھ پاتیں تو یہ کہتی ہوئی واپس لوٹ جاتیں "بھگوان کی مرضی ہے کہ میں آج بھی کچھ نہ کھاؤں" پھر اسی طرح گھر کے کام دھندوں میں لگ جاتیں۔ پتلی بائی بہت دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سمجھ دار بھی تھیں راجکوٹ کے محل کی سب رانیاں اُن کی بڑی عزت کرتیں اور راج ماتا تو اُن سے بے پوچھے کوئی کام ہی نہ کرتی تھیں۔

"پتلی بائی کے چاروں بچوں میں سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے میں چھ سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ سب سے چھوٹا آج سے کوئی اسّی برس اُدھر ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ دیکھنے میں بہت سُندر تو نہ تھا پر نہ جانے کیوں کرم چند، پتلی بائی اور تینوں بچے اُسے دیکھ کر پھولے نہیں سماتے۔



سب بچے بار بار ننھے کو دیکھنے آتے۔ ننھا آنکھیں کھولے انگوٹھا منہ میں ڈالے سب کو تکا کرتا۔

"ننھے کے پتاجی نے ایک شُبھ دن دیکھ کر اُس کا نام موہن داس رکھا" اور کاٹھیاواڑ کے رواج کے مطابق باپ کا نام کرم چند اور گھرانے کا نام گاندھی ساتھ مل گیا۔ اِس طرح بچّے کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی پڑ گیا۔

"موہن داس جب پانچ برس کا ہوا تو اسے اسکول بھیجا گیا، سبق تو وہ کسی نہ کسی طرح یاد کر ہی لیا کرتا تھا، پر پہاڑے اُسے کسی صورت یاد نہ ہو پاتے۔ اِدھر یاد کئے اُدھر صاف۔

"موہن داس کی عمر کوئی سات برس کی ہوگی جب کرم چند کو نوکری کے سِلسلے میں پوربندر چھوڑ کر راجکوٹ آنا پڑا تھا۔ پرانا گھر چھوٹنے کا سب بچّوں کو بہت رنج تھا، پر راجکوٹ پہنچتے ہی دو چار دِن میں وہ اپنے پرانے گھر کو بھول گئے اور نئے گھر میں چین سے رہنے لگے۔

"موہن داس کی ماتاجی پُرانے ڈھنگ کی تھیں۔ چھوت چھات کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ موہن داس کو ہمیشہ بتاتی رہتیں کہ کسی اچھوت کو چھو لو تو فوراً نہا دھو کر کپڑے بدل ڈالو۔ موہن داس کے گھر میں اُن کے بھنگی کا لڑکا اوکا صفائی کرنے آیا کرتا۔ اگر موہن داس کبھی بھول کر اُسے چھو لیتا تو فوراً اُس کی ماتاجی اُس کو نہلواتیں۔ موہن داس نہانے کو تو نہا لیتا پر یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آتی کہ اوکا نیچ اور اچھوت کیسے

ہو سکتا ہے ۔ دھیرے دھیرے اس کا دل یہ چاہنے لگا کہ میں بھی کِسی طرح اچھوت بن جاؤں اور پھر اچھوت کو برہمن کے برابر اونچا کر دکھاؤں۔

"موہن داس یوں تو ہر طرح معمولی بچّوں جیسا تھا پر اس میں خاص بات یہ تھی کہ وہ سدا سچ بولتا تھا۔ چاہے سچ بولنے کی وجہ سے اُسے کچھ ہی کیوں نہ سہنا پڑے۔ ایک دِن کی بات ہے موہن داس انگریزی کا پرچہ کر رہا تھا۔ ایک انگریز صاحب امتحان لینے آئے تھے۔ کسی شبد کے ہجّے موہن داس نے ٹھیک نہ لکھے۔ ماسٹر جی نے اشاروں سے موہن داس کو سمجھانا چاہا کہ وہ اپنے ساتھ والے لڑکے کی کاپی سے نقل کر لے۔ جب ماسٹر جی اشارہ کرتے کرتے تنگ آ گئے تو انھوں نے اپنے جوتے کی نوک بچارے موہن داس کے پاؤں پر اس زور سے رکھی کہ غریب بلبلا اُٹھا، پر اُس کے صاف اور سچّے دل میں یہ بات آ ہی نہ سکی کہ ماسٹر صاحب اُسے نقل کرنے کا اشارہ کر رہے تھے۔"

ہری: "امّاں! ماسٹر صاحب بھی خوب تھے کہ لڑکوں کو نقل کرنے پر اُکساتے تھے۔ اگر ہمارے ماسٹر صاحب ہمیں نقل کرتے دیکھ لیں تو کان پکڑ کر باہر نکال دیں۔"

ماں: "ہاں بیٹا ٹھیک ہے، پر یہ تو دیکھو کہ موہن داس نے کتنی ایمان داری سے کام لیا۔"

ہری: "اچھا ماتا جی پھر کیا ہوا؟"

۲

ماں: موہن داس پر دو کہانیوں کا بڑا اثر پڑا۔ ان میں سے ایک راجہ ہریش چندر کی کہانی تھی۔ جس کا ناٹک موہن داس بار بار جا کر دیکھا کرتا تھا اور دوسری شروَن کمار کی۔ پہلی کہانی یہ ہے:-

"کہتے ہیں ہزاروں برس پہلے ہمارے دیس میں ایک بہت سچا اور سخی راجہ تھا۔ ایک بار اُس کی نگری میں بڑا بھاری کال پڑا۔ راجہ نے اپنا سب کچھ بیچ کر پرجا کی سیوا میں لگا دیا۔ اور خود کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ ایشور کا کرنا، دیوتاؤں کو بھی اسی گھڑی راجہ کے دھرم اور سچائی کو پرکھنے کی سوجھی۔ ایک دیوتا سادھو کا بھیس بدل کر راجہ سے بھیک مانگنے آیا۔ گھر میں جو کچھ تھا راجہ نے لا کر



بھکاری کو دے دیا۔ بھکاری نے پھر سوال کیا تو راجہ نے اپنے داس و اسی بیچ کر، وہ دام بھکاری کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ بھکاری نے پھر کہا: "مہاراج! میرا کام اِتنے میں نہیں چلے گا۔ تم کہو تو پاس ہی جو ڈوم رہتا ہے اس سے جا کر بھیک مانگوں، پر مجھے شرم آتی ہے کہ راجہ کے در کا بھکاری ڈوم کے سامنے ہاتھ پھیلائے" اس بات کے سنتے ہی راجہ ہریش چندر خود سادھو کے ساتھ اس ڈوم کے ہاں گیا اور اِس نے اپنے آپ کو ڈوم کے ہاں گروی رکھوا کر سادھو کا سوال پورا کیا۔ سادھو نے تو اپنے گھر کی راہ لی اور ڈوم نے راجہ کو مرگھٹ پر نوکری بجانے بھیج دیا۔ وہاں وہ چِتا کے لئے آگ دیتا تھا اور جو لوگ مردے جلانے آتے اُن سے ٹیکس لیا کرتا تھا۔



"کچھ دن بعد راجہ ہریش چندر کا اکلوتا بیٹا روہی تاش مر گیا۔ اسے جلانے کے لئے رانی مرگھٹ پہنچ کر چِتا تیار کر رہی تھی کہ راجہ نے بڑھ کر ٹیکس مانگا۔ رانی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "سوامی میرے پاس تو تن کی اِس دھوتی کے سوا

اور کچھ بھی نہیں، راجہ کا دل ہل گیا، پر اس کے پانوں نہیں ڈگمگائے۔ وہ ہمّت سے کام لے کر بولا رانی! میں مجبور ہوں۔ میرے سوامی کا حکم ہے کہ چِتا کے لئے آگ دینے سے پہلے ٹیکس وصول کرلو۔ یہ دھرم نبھانا میرے لئے ضروری ہے۔ جیسے ہی رانی نے دھوتی کے آنچل پر ہاتھ ڈالا ویسے ہی راجہ اور رانی کی سچّائی، اُن کا صبر اور ہمت دیکھ کر دیوتا کانپ اُٹھے۔ وہ فوراً اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر آ پہنچے، اُنھوں نے راجہ کے بیٹے میں پھر سے جان ڈالی اور راجہ رانی اور بیٹے تینوں کو ڈوم سمیت وہ بیکنٹھ لے گئے۔

بیٹا ہری! یہ کہانی موہن داس کے دل میں گھر کر گئی، اِس کا جی چاہتا تھا کہ پرماتما اُسے ہمت دے کہ وہ بھی سچائی کی کسوٹی پر ہریش چندر کی طرح پورا اُترے۔ بڑے ہو کر موہن داس نے سچ مچ سچّائی کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی اور کسوٹی پر ایسا کھرا اُترا کہ دنیا دنگ رہ گئی"۔

کہانی سُناتے سُناتے ہری کی ماتا کی آواز بھرّا گئی۔ تھوڑی دیر رُک کر پھر انھوں نے یوں کہنا شروع کیا:۔

"دوسری کہانی شرون کمار کی تھی جسے پڑھ کر موہن داس نے لوگوں کی سیوا کرنی سیکھی۔ شرون کمار کے ماں باپ دونوں بوڑھے اور اندھے تھے وہ اُنھیں ہر جگہ بہنگی میں اٹھائے پھرتا۔ محنت مزدوری کر کے وہ اُن کا پیٹ پالتا اور ہر طرح سیوا کرتا۔ قسمت کا لکھا، دشرتھ مہاراج ایک



دن جنگل میں شکار کھیلنے
نکلے۔ شرون ندی کے کنارے
اپنے ماں باپ کے لئے
پانی بھر رہا تھا۔ دشرتھ نے
دُور سے شرون کو ہرن سمجھ
کر اس پر تیر چلا دیا۔ بچارا
گھائل ہو کر درد سے تڑپنے
اور کراہنے لگا۔ پر اس وقت بھی اسے اپنے بوڑھے ماتا پتا کا خیال ستا
رہا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے دشرتھ ہی کے ہاتھ انھیں پانی بھجوایا
اور کہا جب پانی پلا چکو تب میرے مرنے کی خبر سُنانا۔ دشرتھ نے ایسا
ہی کیا۔ جب وہ
دونوں پانی پی
چکے تو دشرتھ
نے شرون کمار
کے مرنے کی خبر
دی۔ بچارے
بوڑھے اور کمزور



تو تھے ہی، اتنا روئے اور اتنا رنج کیا کہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ دشرتھ نے شرون کمار کی چتا کے ساتھ ہی ساتھ اس کے ماں باپ کی چتائیں بھی تیار کیں اور تینوں کو آگ کے سپرد کر دیا۔"

ہری: "اماں! پھر دشرتھ جی کا کیا ہوا؟"

ماں: "بیٹا! دشرتھ بھی اپنے بیٹے کی جدائی میں مرے۔"

ہری: "اچھا اماں! بابا نے یہ کہانی پڑھ کر کیا کیا؟"

ماں: "بالک موہن نے یہ کہانیاں سُن کر ہریش چندر کی طرح سدا سچ بولنے اور شرون کمار کی طرح دُکھیوں کی سیوا کرنے کی ٹھان لی۔ ہریش چندر اور شرون اب ہمیشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگے۔ شرون نے تو ماں باپ ہی کی سیوا کی، پر موہن داس نے بڑے ہو کر کروڑوں انسانوں کی سیوا میں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ چالیس کروڑ انسان جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی، مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، براہمن بھی تھے اور ہریجن بھی، راجہ بھی تھے اور بھکاری بھی، سب اُس کے لئے ایک تھے۔ اس کے دل میں سب کے لئے ایک سا پریم تھا۔"

ہری مورت بنا کہانی سُن رہا تھا۔ ماتا جی کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس پر اتنا اثر ہو رہا ہے جیسے ایک ایک بات اُس کے دل میں اُتر رہی ہو۔ انھوں نے اُٹھ کر کھڑکی بند کی جس میں سے بڑی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی اور پھر کہنا شروع کیا۔



۳

موہن داس کے ماتا پتا نے اُس کی شادی لڑکپن ہی میں پوربندر کی ایک لڑکی کستورا بائی سے کر دی تھی۔ اس وقت تو موہن داس کے دل میں لڈّو پھوٹ رہے تھے کہ شادی کے بعد اچھے اچھے کپڑے پہننے کو ملیں گے اور ایک نئی لڑکی ساتھ کھیلنے کو، پر جب موہن داس بڑا ہو گیا تو اُس نے لڑکپن کی شادی کو سدا بُرا بتایا اور ہمیشہ ایسی شادیوں کے خلاف رہا۔

بیاہ ہوتے ہی موہن داس نے بچاری بھولی بھالی کم سن کستورا بائی پر سختیاں کرنی شروع کر دیں۔ یہاں مت جاؤ، وہاں مت جاؤ، اس سہیلی سے مت ملو، اُس سے مت ملو۔ موہن داس کی اِن اُلٹی سیدھی باتوں سے کستورا بائی کا ناک میں دم آگیا۔ جتنا وہ کستورا بائی کو بے جا دبانا چاہتا اُتنا ہی وہ اُس کا مقابلہ کرتی۔ کئی بار تو اِن باتوں پر اتنی کھٹ پٹ ہو جاتی اور کھچاؤ اتنا بڑھ جاتا کہ دونوں کی بول چال تک بند رہتی۔"

ہری: "اماں! موہن داس ایسا کیوں کرتے تھے؟"

ماں: "بات یہ تھی کہ وہ اس لڑائی جھگڑے ہی کو پریم کی نشانی سمجھتا تھا۔ شادی کے

جھنجھٹ میں پھنس کر بھی موہن داس کا اِسکول جانا بند نہیں ہوا۔ اتنا ہی نہیں، اُوپر کے درجوں میں پہنچ کر تو وہ کلاس کے ہوشیار لڑکوں میں گِنا جانے لگا۔

اُس نے سدا یہ کوشش کی کہ لوگ اُسے سچّا اور اپنی بات کا دھنی سمجھیں۔ اگر کبھی ہنسی میں بھی کوئی اُسے جھوٹا کہہ بیٹھتا تو اُس کے دِل پر بہت چوٹ لگتی اور وہ گھنٹوں رویا کرتا۔

"موہن داس کو ایک شوق یہ بھی تھا کہ وہ اپنے بھٹکے ہوئے ساتھیوں کو کھینچ کر سچّائی اور نیکی کے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کیا کرتا۔ کبھی کبھی کامیابی بھی ہو جاتی تھی۔ اِسی شوق کی وجہ سے لڑکپن میں اُس نے ایک بہت ہی بُرے اور آوارہ لڑکے سے دوستی کر لی۔ کستورا بائی نے، یہاں تک کہ موہن داس کے ماتا پِتا نے بھی ہزار روکا کہ وہ اِس لڑکے سے مِلنا چھوڑ دے، پر موہن داس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

"اِس کا دوست خوب جانتا تھا کہ موہن داس بڑا ڈرپوک اور دبّو ہے۔ کبھی اندھیرے کمرے میں نہیں جاتا۔ پر چاہتا یہ ہے کہ کسی طرح بڑا بہادر اور بلوان بن جاؤں۔ اُس نے موہن داس سے کہا: 'موہن! بہادر بننے کی ایک ہی ترکیب ہے اور وہ یہ کہ تم گوشت کھانا شروع کر دو۔ دیکھ لو، انگریز ہندوستانی سے کہیں بڑھ کر ہٹّا کٹّا اور بلوان ہوتا ہے اور گوشت کھانے ہی کی وجہ سے کمزور ہندوستانیوں پر راج کرتا ہے۔ بھولے بھالے اور بہادری کی دُھن

کے متوالے موہن داس نے اسے سچ مان لیا اور وہ گوشت کھانے کو تیار ہو گیا۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو ہری! کہ وشنو دھرم میں گوشت کھانا منع ہے۔ موہن داس گوشت کھاتا تو کیسے کھاتا۔ اُس کے گھر میں گوشت آتا نہ تھا۔ بس اُس کے دوست نے یہ طے کیا کہ وہ موہن داس کی دعوت کرے گا اور اُس کے گھر والوں سے چھُپا کر موہن داس کو گوشت کھلائے گا۔

"دعوت کے دن شام کو موہن داس اپنے دوست کے گھر پہنچا اور سب کھانا کھانے بیٹھے۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ گوشت کی بوٹی اس کے گلے سے اُتر جائے پر نہ اُتری۔ آخر بے چارے کو قے ہو گئی۔ اور وہ مجبور ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ گھر پہنچ کر موہن داس کا بُرا حال ہوا۔ سوتے جاگتے اسے ایسا لگتا جیسے بکری اس کے پیٹ کے اندر ممیا رہی ہو۔ اس کے بعد بھی موہن داس نے کئی بار گوشت کھانے کی کوشش کی پر اُسے کبھی گوشت نہ بھایا۔

"گوشت کی دعوتوں کے بعد سدا دیر سے گھر پہنچتا اور ہر بار اُسے اپنے گھر والوں سے جھوٹ بولنا پڑتا۔ دو چار بار تو دیر سے گھر آنے کی جھوٹی سچی وجہ بتا دی۔ پر ایک دن اسے ایکا ایکی سوجھا کہ ماتا پتا سے جھوٹ بول کر اور انھیں دھوکا دے کر اگر میں بہادر اور بلوان ہو بھی

جاؤں تو کس کام کا۔ یہ سوچتے ہی اس نے ٹھان لیا کہ گوشت کبھی نہ کھاؤں گا اور ہمیشہ سچ بولوں گا، چاہے میں کتنا ہی کمزور اور ڈرپوک کیوں نہ رہ جاؤں۔ ماتا پتا سے جھوٹ بول کر اور انہیں دھوکا دے کر نڈر اور بلوان ہونا بے کار ہے؛

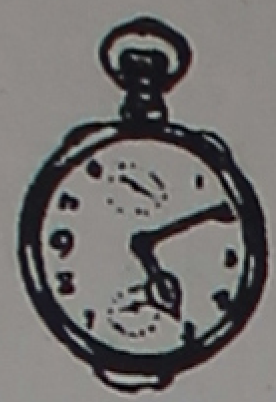
ہری نے حیران ہو کر پوچھا: "تو پھر ماں! وہ اتنے نڈر اور بہادر کیسے بن گئے؟"

ماں: "جھوٹ بولنا تو موہن داس نے چھوڑ دیا۔ پر نڈر اور بہادر بننے کی لگن اُس کے دل میں لگی رہی۔ موہن داس کے گھر میں رمبھا نام کی ایک بڑھیا کھلائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ موہن داس کو اندھیرے سے کتنا ڈر لگتا ہے۔ رمبھا نے ایک دن باتوں باتوں میں کہا 'جب بھی تمھیں اندھیرے میں ڈر لگے یا کوئی مشکل آن پڑے تو فوراً رام نام جپنے لگو۔ اس نام کی برکت سے تمھارا ڈر جاتا رہے گا'؛

ہری: "اماں! تو کیا سچ مچ رام نام جپنے سے ان کے دل کا ڈر جاتا رہا؟"

ماں: "اُس نام میں بڑی برکت ہے اگر کوئی بھگوان کو سچے دل سے پکارے تو بھگوان اُس کی ضرور سنتے ہیں۔"

ہری: "میں بھی رام نام جپا کروں گا مجھے بھی تو اندھیرے کمرے میں جاتے ڈر لگتا ہے۔"



۴

"گوشت کھانے کی دُھن تو موہن داس نے اپنے بڑوں کی خاطر چھوڑ دی۔ پر اب جلدی سے بڑا ہونے کی لگن اُسے دن رات ستاتی ۔ جب بچّوں کو بڑا بننے کا شوق چرّاتا ہے تو اُنھیں طرح طرح کی سوجھتی ہے۔ وہ بڑوں کی نقلیں اُتار کر بڑے ہونے کا ارمان پورا کرتے ہیں۔ جب کبھی موہن داس اپنے چچا کو منہ سے دُھوئیں کے بادل اڑاتے دیکھتا، اس کا دل مچلتا کہ وہ بھی اُن کی طرح سگریٹ پی کر مُنہ اور ناک میں سے دُھواں نکالے۔ موہن داس نے ایسا ہی کرنے کی ٹھانی اور یہ طے پایا کہ وہ اور اس کا ایک دوست سگریٹ پیا کریں گے۔ پر پیتے تو کہاں سے، جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ جب موہن داس کے چچا اُٹھ کر چلے جاتے تو موہن داس اور اُس کا دوست چپکے سے آتے اور اِدھر اُدھر پڑے ہوئے سگریٹ کے اَدھ جلے ٹکڑے اُٹھا لے جاتے اور چھُپ چھُپ کر خوب پیا کرتے۔ مگر تھوڑے دنوں کے بعد جب اُس سے اُن کی تسلّی نہ ہوئی تو پھر نوکروں کی جیب میں سے پیسے نکال کر سگریٹ مول لینے لگے۔

لیکن اس طرح چھُپ چھپ کر سگریٹ پینے سے اُن کا جی خوش نہ ہوتا۔ ایک دن دونوں بہت اُداس بیٹھے سوچ رہے تھے کہ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے کہ ہم کھُل کر بڑوں کی طرح سگریٹ بھی نہ پی سکیں۔ اس کا خیال کرتے ہی اُن کا اور بھی جی گھٹنے لگا۔ دونوں کے من میں سمائی کہ چلو چل کر دونوں کہیں جان دے دیں۔ یہ ٹھان کر انھوں نے دھتورے کے بیج جمع کئے اور اِس "نیک" کام کے لئے شام کا وقت چُنا۔ وہ بیج کھانے ہی کو تھے کہ پھر خیال آیا کہ اگر یہ کھا کر بھی نہ مرے تو کیا ہوگا؟ یہ سوچتے ہی انھوں نے مرنے کا ارادہ چھوڑ دیا اور سگریٹ نہ پینے کا عہد کر لیا۔"

بری: "اماں! موہن داس نے بڑے ہو کر تو سگریٹ پیا ہی ہوگا؟"

ماں: "نہیں بیٹا وہ دن اور آج کا دن، اُس نے کبھی سگریٹ منہ سے نہیں لگایا۔ جان دینے کا خیال بھولتے ہی اُن دونوں کے دل پر سے بوجھ سا اُتر گیا اور زندگی انھیں پھر پہلے ہی جیسی سُہانی لگنے لگی۔

"ایک دن موہن داس گھر میں بیٹھا کچھ لکھ پڑھ رہا تھا کہ اُس کا بھائی گھبرایا ہوا آیا اور اُس کے پاس بیٹھ گیا اور چپکے چپکے موہن داس کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ بات یہ تھی کہ موہن داس کے بھائی پر بیس پچیس روپے کسی کے اُدھار ہو گئے تھے۔ وہ اِس رقم کو چکانے کے لئے اپنے بھائی کی مدد چاہتا تھا موہن داس نے بہت سوچا اور بہت سوچنے کے بعد ایک ترکیب نکالی۔

موقع پاکر موہن داس چپکے سے گیا اور رات کے وقت اپنے دوسرے بھائی کے بازوبند میں سے تھوڑا سا سونا اُڑا لایا اور اسے بیچ کر ادھار چکا دیا۔"

ہری: "اماں! آپ تو کہتی ہیں چوری کرنا بُری بات ہے، پھر موہن داس نے چوری کیوں کی؟"

ماں: "بیٹا ہری! بھولے سے ایسے کام سب ہی بچے کر بیٹھتے ہیں۔ پر نیک بچے وہ ہیں جو بھول کرنے کے بعد پچھتائیں اور پھر عمر بھر ویسی حرکت نہ کریں۔

"موہن داس نے ایک بھائی کے کارن دوسرے بھائی کی چوری کرنے کو تو کر لی، پر اب اس کے دل کو چین کہاں۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ بہت سوچ بچار کرنے کے بعد اس نے چپکے سے اپنے پتا جی کو ایک چٹھی لکھی جس میں چوری کا حال تھا، چوری نہ کرنے کا وعدہ اور سزا کی درخواست تھی، اور یہ بھی لکھا تھا کہ پتا جی جتنی کڑی سزا چاہیں دیں پر اپنا دل نہ دُکھائیں۔



موہن داس کے پتا ان دنوں بیمار تھے وہ سارا دن لیٹے رہتے تھے۔ موہن داس نے چٹھی لے جا کر ان کے

ہاتھ میں دے دی اور ان کے پاس ہی ایک پلنگ پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"موہن داس کے پتا جی نے بیٹھ کر چھٹی پڑھی تو اُن کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں گرنے لگیں۔ جوں جوں آنسو گرتے تھے موہن داس کے دل کا پاپ جیسے دُھلتا جا رہا تھا۔ موہن داس پر اِن انمول آنسوؤں کا اتنا اثر ہوا کہ اس کی زندگی بدل گئی اور وہ پہلے سے بڑھ کر اچھا لڑکا بن گیا۔"

ہری: "اماں! موہن داس کے پتا جی روئے کیوں۔ اُنھوں نے موہن داس کو پیٹا کیوں نہیں"؟

ماں: "بیٹا! موہن داس کی سچائی اور ہمت دیکھ کر اُس کے پتا جی کا دِل بھر آیا۔ اگر وہ موہن داس کو مارتے تو اُس پر وہ اثر نہ ہوتا جو اُنھوں نے موہن داس کو مارے پیٹے بنا خود دِل کو دُکھا کر پیدا کیا۔ موہن داس پر اِس پریم کا اثر مار پیٹ سے کہیں زیادہ ہوا۔

"موہن داس کی زندگی میں اہنسا کا یہ پہلا سبق تھا۔ بڑے ہو جانے پر اس نے اِسی اہنسا کے بل پر انگریزوں سے لڑے بِنا ان کو ان کے گھر پہنچا دیا اور اپنے دیس کو آزاد کرا لیا۔

"دو چار دن میں چوری کی بات آئی گئی ہو گئی، ہاں اس کے بعد سے اتنا ضرور ہوا کہ موہن داس کے پتا جی اسے پہلے سے زیادہ چاہنے لگے اور کیوں نہ چاہتے وہ تھا بھی تو بڑا سچا اور نیک لڑکا۔"

ہری: "اماں! میں بھی اب سدا سچ بولا کروں گا، تو مجھے پتا جی پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگیں گے۔"

ماں: "ہاں بیٹا! ایک تمھارے پتا جی کیا سبھی سچے کو پیار کرتے ہیں۔"

ہری: "اچھا اماں! پھر کیا ہوا؟"

ماں: "بھگوان کی کرنی، انہیں دنوں موہن داس کے پتا جی بہت بیمار رہنے لگے سب گھر والے اُن کی دیکھ بھال میں لگے رہتے۔ موہن داس اُن کی سیوا سب سے زیادہ کرتا تھا۔ وہ اِسکول کے بعد جلدی جلدی گھر آتا اور سارے وقت اپنے پتا جی کے پاس رہتا۔ اُن کو دوا پلاتا کپڑے بدلواتا اور گھنٹوں بیٹھ کر اُن کے پاؤں دبایا کرتا۔ ایک رات کو پاؤں دبانے کے بعد وہ کسی کام سے اپنے کمرے میں گیا ہی تھا کہ نوکر نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا اور خبر دی کہ پتا جی چل بسے۔ موہن داس کو اس وقت اُن کے پاس نہ رہنے کا رنج مرتے دم تک رہا۔"

ہری: "ہائے ہائے کتنا رویا ہوگا بچارا!"

ماں: "ہاں بیٹا! اور آج خود اُس کو سارا ہندوستان بلکہ ساری دُنیا رو رہی ہے۔"





۵

"اٹھارہ برس کی عمر میں موہن داس نے دسویں پاس کرلی۔ اُس کے پتا جی کے ایک بڑے پرانے دوست کے کہنے پر موہن داس کے بڑے بھائی نے اُسے بیرسٹری پاس کرنے ولایت بھیج دیا۔ اُن دنوں لوگ سمجھتے تھے کہ ولایت میں رہ کر مذہب کی پابندی نہیں ہوسکتی۔ اِسی لئے موہن داس کے گھر والے اُسے وِلایت بھیجنے پر بڑی مشکل سے راضی ہوئے۔

"وہاں بھیجنے سے پہلے اُس کی ماتا نے موہن داس سے تین وعدے لئے۔ پہلا یہ کہ گوشت نہیں کھاؤں گا۔ دوسرا یہ کہ شراب نہیں پیوں گا اور تیسرا یہ کہ وہاں کی سب لڑکیوں کو اپنی بہن کی طرح سمجھوں گا۔ موہن داس نے سچّے دل سے سب وعدے کئے اور اپنی ماتا جی، بھائی اور بزرگوں کی دعائیں لے کر ولایت سدھارا۔

"جانے سے پہلے موہن داس نے بہت سے انگریزی کپڑے سلوائے، چمک دار جوتے اور رنگ برنگ کی ٹائیاں خریدیں۔ پہلے پہل تو موہن داس کو ٹائی باندھنے کا ڈھب نہ آتا تھا پر جب باندھنی آگئی تو انگریزی کپڑوں میں

ٹائی اُسے سب سے زیادہ اچھی لگتی۔

"جس دِن جہاز انگریزی بندرگاہ میں جا کر لگا، موہن داس نے سوچا کہ اِنگلستان کی زمین پر پہلی بار پاؤں رکھنے کے لئے سب سے بڑھیا کپڑے پہننا ضروری ہے۔ فوراً بکس کھول کر ایک سفید فلالین کا سوٹ نِکالا اور بڑے ٹھاٹھ سے اُسے پہن کر جہاز سے اُترا۔ اب جو آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے تو اِدھر سے اُدھر تک سب لوگ گہرے رنگوں کے سوٹ پہنے ہوئے ہیں، وہ اکیلا سفید سوٹ پہنے ہے اور سب اُسے اچنبھے سے دیکھ رہے ہیں۔ شرم کے مارے موہن داس کو پسینہ آگیا۔ جوں توں کر کے ہوٹل پہنچا۔ اتفاق کی بات کہ دوسرے دن اتوار تھا اور دفتر بند ہونے کے کارن بندرگاہ سے سامان نہیں آسکتا تھا۔ بچارا موہن داس تین دن تک وہی سفید سوٹ پہنے رہا، پر جہاں تک ہو سکا ہوٹل کے کمرے سے باہر نہ نکلا۔

"ولایت میں موہن داس نے دیکھا کہ فیشن والے سب لوگ اونچا ہیٹ پہنتے ہیں۔ اُسے بھی شوق چرّایا کہ وہ بھی اونچا ہیٹ خریدے، شرمیلا تو تھا ہی بڑی ہمت کر کے ہیٹ والے کی دوکان پر پہنچا اور جو ہیٹ سب سے پہلے نظر آیا اُسی کو خرید کر گھر آگیا۔ گھر آکر جو ہیٹ پہنا تو معلوم ہوا کہ سر سے انگل بھر بڑا ہے۔ وہ تو یوں کہو کہ اس کے بڑے بڑے کان اُس وقت اُس کے کام آگئے نہیں تو ہیٹ کھسک کر ناک پر آجاتا اور کچھ بھی نہ سوجھتا"

ہری: "اماں! چھوٹا سا لڑکا بڑا سا ہیٹ پہن کر کیسا عجیب لگتا ہوگا؟ میں وہاں ہوتا تو اپنے کیمرے سے اس کی تصویر کھینچ لیتا۔"

ماں: "ہاں عجیب تو لگتا ہی ہوگا۔

"دوسرے ہندوستانی لڑکوں کی طرح موہن داس نے بھی ولایت جاکر پہلے پہلے دل کھول کر خرچ کیا۔ ناچنا سیکھا، وایولن بجانا سیکھا، بڑھیا بڑھیا دوکانوں سے کپڑے سلوائے، سونے کی گھڑی خریدی۔ مطلب یہ کہ جی بھر کے روپیہ پھینکا۔ پر ایک بات موہن داس میں بڑی اچھی تھی۔ وہ سدا پائی پائی کا حساب لکھتا تھا۔ ایک دن موہن داس کو خیال آیا کہ اگر میں کھیل تماشوں اور دکھاوے کے کاموں میں لگا رہا تو پڑھوں گا کیسے اور کب تک میرے بڑے بھائی مجھے روپیہ بھیجتے رہیں گے۔ یہ خیال آتے ہی موہن داس نے اپنے خرچے کی کتاب نکالی اور جو جو چیزیں اُسے مہنگی اور نکمی لگیں اس نے انھیں چھوڑ دینے کی ٹھان لی۔ جہاں تک ہو سکا موہن داس نے بسوں میں بیٹھنا کم کر دیا۔ اس نے سستا مگر صحت کے لئے اچھا کھانا پکانا سیکھا۔ اور دو بڑے بڑے کمروں کی جگہ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہنے لگا۔

"اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ولایت میں اسے دوسرے دھرموں کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کا موقع بھی ملا۔ لڑکپن میں اس کے پتا جی کے پاس جین، ہندو، بودھ، پارسی، عیسائی اور مسلمان سب آیا کرتے تھے اور گھنٹوں

سب دھرموں کے بارے میں بات چیت ہوا کرتی تھی. موہن داس چپ چاپ بیٹھا سب سنا کرتا. تب ہی سے وہ سب دھرموں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا. اس نے لڑکپن ہی سے یہ طے کر لیا تھا کہ نیکی سب دھرموں کی جڑ ہے اور بنا سچائی آدمی نیک نہیں بن سکتا.

"ولایت ہی میں اسے روگیوں کی سیوا کرنے کی دھن سوار ہوئی. ایک ڈاکٹر کی مدد سے اس نے کوڑھیوں کی دیکھ بھال کرنی سیکھی. تھوڑے ہی دن کے اندر وہ اس کام میں ایسا ہوشیار ہو گیا کہ دیکھنے والوں کو اچنبھا ہوتا تھا"۔

ہری: "ماں! اتنی جلدی اس نے یہ کام کیسے سیکھ لیا؟"

ماں: "بیٹا! کسی بات کی بھی جی میں لگن لگ جائے تو وہ کام جلدی آجاتا ہے. پھر موہن داس کا دِل غریبوں کی طرح رہ کر اور دکھیوں کی سیوا کر کے بہت خوش ہوتا تھا.

"موہن داس نے اپنے بہت سے ساتھیوں کو پیرس شہر کی تعریف کرتے سنا تھا کہ پیرس شہر بہت بڑا سندر اور صاف ستھرا ہے. اس کے ہندوستان لوٹنے سے کچھ مہینے پہلے پیرس میں ایک بہت بڑی نمائش کی تیاریاں ہو رہی تھیں. اس نے سوچا چلو ایک ہی پھیرے میں پیرس کا شہر اور وہاں کی نمائش دونوں دیکھ لیں.

"پیرس میں نمائش میدان کے بیچوں بیچ لوہے کا ایک بہت اونچا مینار بنایا گیا تھا۔ یہ مینار دلّی کی قطب کی لاٹ سے کوئی تگنا اونچا تھا۔ نمائش دیکھنے والے مینار پر ضرور چڑھتے تھے۔ اسی مینار پر ایک ہوٹل بھی تھا جہاں کھانا کھاتے تھے اور وہیں بیٹھے بیٹھے نمائش کی سیر بھی کرتے تھے۔ موہن داس نے بھی مینار کا ٹکٹ لیا اور اسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔

"نمائش دیکھنے کے بعد موہن داس نے پیرس کی سب بڑی بڑی مشہور جگہیں دیکھیں۔ سب سے زیادہ اُسے وہاں کے پرانے گرجے پسند آئے اور نوتر دام کا گرجا تو اُسے بہت ہی اچھا لگا۔"

ہری: "لوہے کی اونچی لاٹ بھی اُسے بہت ہی اچھی لگی ہوگی؟"

ماں: "نہ جانے کیوں وہی اُسے پسند نہیں آئی مگر ہاں پیرس کی پرانی عمارتیں اُسے بہت اچھی لگیں۔

"موہن داس نے بیرسٹری پاس کرنے کے بعد ہندوستان لوٹنے کی تیاری کی۔ جولائی کے مہینے میں سمندر کے طوفان اور ہوا کا سامنا کرتا ہوا اُس کا جہاز بمبئی میں آکر رُکا۔

"بندرگاہ پر اس کے بڑے بھائی اُس کو لینے آئے تھے۔ موہن داس اپنی ماتا جی سے ملنے کے لئے بہت بے چین تھا۔ پر جب بمبئی پہنچ کر اُس نے اپنے بھائی سے سُنا کہ اس کی ماتا بھگوان کو پیاری ہو چکیں اور جب وہ گھر

پہنچے گا تو ماں اُسے گلے لگانے اور پیار کرنے کے لئے دروازے پر کھڑی نہیں ملیں گی، تو اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا، پر موہن داس کا دل بہت پکّا تھا۔ آنسو پی کر رہ گیا اور اُف تک نہ کی۔"

ہری: "ہائے اُس سے کیسے چُپ رہا گیا اور کوئی ہوتا تو رو رو کر آنکھیں سُجا لیتا۔"

ماں: "پر وہ اور کوئی تھوڑے ہی تھا وہ تو موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔"





۶

"موہن داس کے بھائی نے اس کے دفتر کے لئے پہلے ہی سے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔" موہن داس نے اس پر "موہن داس کرم چند گاندھی" کا بورڈ لگا کر بیرسٹری کا کام شروع کر دیا۔ پر اس کا کام بمبئی میں نہ چل سکا۔ چھ مہینے کی جی توڑ محنت کرنے کے بعد وہاں کا دفتر بند کر کے وہ راجکوٹ چلا گیا اور وہاں دفتر کھولا۔ راج کوٹ میں اس کا کام اچھا چل نکلا پر وہاں گاندھی کا دِل بالکل نہ لگا۔ وہاں کے لوگوں میں جھوٹ اور مکّاری دیکھ دیکھ کر اُس کا دِل اُچاٹ ہو گیا۔

"پوربندر میں گاندھی گھرانے سے دادا عبداللہ کمپنی والوں کا بہت مِلنا جُلنا تھا۔ بھگوان کا کرنا انھیں دنوں دادا عبداللہ کمپنی کا بہت بڑا مقدمہ دکھنی افریقہ میں چل رہا تھا۔ انھوں نے گاندھی کو اِس مقدمے کی پیروی کے لئے ڈربن بھجوا دیا۔

"گاندھی.........ار.........نہیں اب گاندھی جی دکھنی افریقہ پہنچے تو دیکھا وہاں کی دنیا ہی دوسری ہے۔ وہاں کالے لوگوں کو، فرنگی (یورپین)

طرح طرح سے تنگ کرتے تھے۔ ہر ہندوستانی کو، چاہے وہ بیرسٹر ہو یا سوداگر، مزدور ہو یا نوکر، قلی، کہہ کر پکارتے اور جو کالے لوگ سچ مُچ قلی کا کام کرتے تھے اُن کے ساتھ تو جانوروں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔

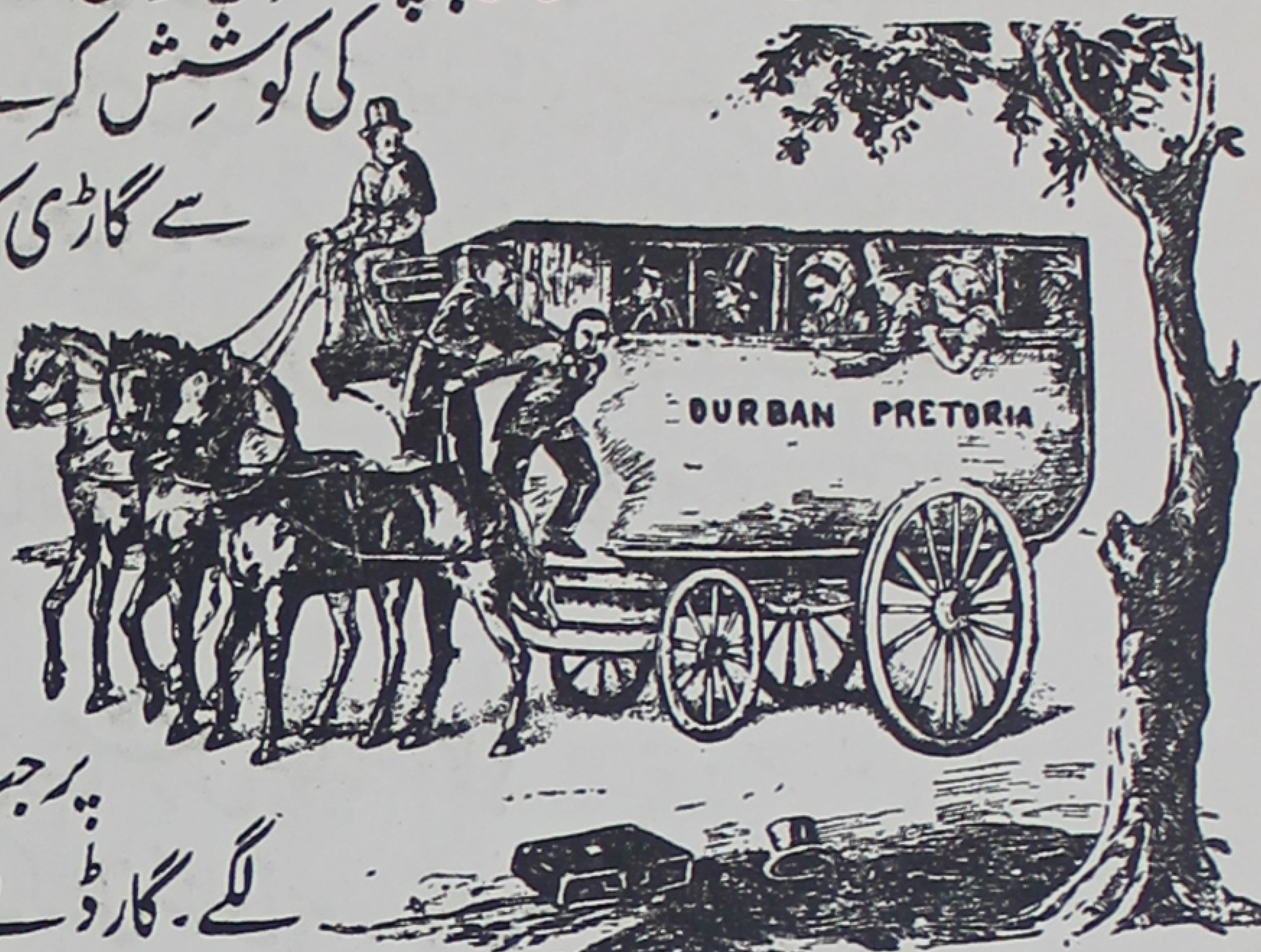
"کوئی کالا آدمی کسی ہوٹل میں نہیں گھس سکتا تھا۔ ٹھہرنا تو رہا دور۔ وہ سڑک کی پٹری پر کسی گورے آدمی کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ پٹری پر سے دھکا دے کر ہندوستانی کو ہٹا دینا ایک معمولی بات تھی۔ کسی ہندوستانی کی مجال نہیں تھی کہ وہ کسی انگریز کے سامنے پگڑی پہن کر جا سکے۔ وہ ریل کے ڈبے یا گھوڑا گاڑی میں انگریز کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اسی طرح اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔"

بچی: "اماں! تو پھر گاندھی جی کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا ہو گا؟"

ماں: "میں تمھیں اُن کی وہاں کی ایک کہانی سُناتی ہوں جِس سے تمھیں پتہ چلے گا کہ گاندھی جی کو کِن کِن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"ایک بار گاندھی جی ڈربن سے پری ٹوریا جانے کے لئے کرائے کی گھوڑا گاڑی میں سوار ہونا چاہتے تھے کہ گاڑی کے گارڈ نے آ کر انھیں روکا اور گاڑی کے اندر انگریز مسافروں کے ساتھ بٹھانے سے انکار کر دیا۔ گاندھی جی کو کسی نہ کسی طرح پری ٹوریا پہنچنا ضروری تھا۔ اس لئے وہ کوچوان کے ساتھ باہر والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گارڈ خود گاڑی کے اندر بیٹھا اور گاڑی چل دی۔

تھوڑی دیر میں گارڈ پھر آیا اور گاندھی جی کو چوان کے پاؤں کے پاس سیٹ سے نیچے بیٹھنے کا حکم دیا۔ انھوں نے وہاں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ گارڈ بھلا کالے آدمی کی بات کیا سُنتا اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بچارے گاندھی جی پر مکّوں اور گالیوں کی بوچھار شروع کر دی اور پھر ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ گاندھی جی بھی پوری ہمّت سے گاڑی کا ہینڈل پکڑے لٹکے رہے۔ گارڈ برابر بے دردی سے انھیں مارتا رہا اور گالیاں دیتا رہا۔ گورے مسافر کچھ دیر تک تو یہ تماشا دیکھا کیے پر جب اُن سے نہ رہا گیا تو وہ گارڈ کو ڈانٹنے لگے۔ گارڈ نے جب دیکھا کہ گورے آدمی بھی اِس کالے آدمی کا ساتھ دے رہے ہیں تو وہ گاندھی جی کا پیچھا چھوڑ کر چُپ چاپ سائیس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ بچارے گاندھی جی کی جان بچ گئی اور انھیں کوچوان کے پاس والی سیٹ پر پھر سے بیٹھنا مل گیا۔



"ارے تم تو رونے لگے، بس اتنا ہی ننّھا سا دل ہے تمھارا۔ ہری، گاندھی جی نے تو اوروں کے لئے اِس سے بڑے بڑے دکھ سہے ہیں اور کبھی اُف تک نہ کی۔ جب لوگ اُن پر ظلم کرتے تو انھیں کبھی جھنجھلاہٹ نہ ہوتی۔ انھیں

رنج ضرور ہوتا تھا پر وہ تمھاری طرح روتے نہ تھے "

ہری نے جھٹ کُرتے کے کونے سے آنسو پونچھ ڈالے۔

ماں : "گاندھی جی نے جب دکھنی افریقہ میں ہندوستانیوں کی بُری دُرگت بنتے دیکھی تو انھوں نے طے کیا کہ وہاں کے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی سب کو مِل کر اپنی شکایتیں وہاں کے سرکاری افسروں تک پہنچانی چاہئیں۔ یہ جی میں ٹھان کر انھوں نے سب لوگوں کو ایک کیا اور اُن کی کوشش سے دکھنی افریقہ میں کانگریس نے جنم لیا۔ سب ہندوستانی کیا امیر اور کیا غریب، تن من دھن سے کانگریس کی مدد کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے وہاں کے افسر ہندوستانیوں کی چھوٹی موٹی شکایتوں پر کان بھی دھرنے لگے۔

ماں : " ہری! شاید تم یہ سوچو کہ آخر گاندھی جی کے افریقہ جانے سے پہلے بھی تو ہندوستانی وہاں بستے تھے اور ان پر فرنگی یہ سب ظلم بھی کرتے تھے پھر کسی اور کو اس طرح ان کی حالت سدھارنے کی کیوں نہیں سوجھی؟ بات یہ ہے کہ کسی کے پاس ایسا دل نہ تھا جو دوسروں کی بپتا دیکھ کر کانپ اٹھتا۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر گاندھی جی ظالم کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ افریقہ میں انھوں نے کمزور اور دکھی ہندوستانیوں کا ساتھ دیا۔

"لوگوں کی اس طرح سیوا کرنے سے گاندھی جی کا نام بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا۔ وہاں کے ہندوستانی انھیں عزت اور پیار سے گاندھی بھائی پکارنے

لگے۔نام کے ساتھ ساتھ اُن کی بیرسٹری بھی چمک اُٹھی۔

"اب وہاں کے لوگوں نے دیکھا کہ گاندھی جی کے بنا اُن کا کام نہیں چلے گا اور نہ اُن کے دکھ دور ہوسکیں گے۔اِس لئے سب نے مِل کر گاندھی جی سے کہا کہ وہ وہیں بس جائیں۔اپنی بیرسٹری بھی کریں اور اپنے ہندوستانی بھائیوں کی سیوا بھی۔گاندھی جی نے بھی اِسی کو مناسب سمجھا اور وہ افریقہ میں بسنے کو تیار ہو گئے اور چھ مہینے کی چھٹی لی کہ ہندوستان جاکر اپنے بیوی بچوں کو لے آئیں۔

"افریقہ سے ہندوستان آنے میں اُن دنوں چوبیس پچیس دِن لگتے تھے گاندھی جی کا جی جہاز پر بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانے لگا۔اُنھوں نے اپنے ساتھی مسافروں میں سے ایک منشی جی کو ڈھونڈھ نکالا اور اُن سے اُردو پڑھنا شروع کردیا۔

"ہندوستان پہنچتے ہی گاندھی جی نے اخباروں اور لیکچروں کی مدد سے افریقہ کے ہندوستانیوں کا سچّا سچّا حال سارے ملک کو بتایا۔سر فیروز شاہ مہتا اور گوکھلے جیسے بڑے بڑے لیڈروں نے اِن کی باتوں پر پورا دھیان دیا اور مدد دینے کا وعدہ کیا۔

"ابھی وہ یہاں لوگوں کو تیار کر ہی رہے تھے کہ دکھنی افریقہ سے بلاوے کا تار آگیا۔گاندھی جی اپنے بال بچّوں کو لے کر افریقہ چل دئے۔راستے میں

سمندری طوفان کی مصیبتیں جھیلتے اور دوسرے مسافروں کی سیوا کرتے کرتے وہ ڈربن واپس لوٹے۔"

ہری: "اچھا اماں پھر کیا ہوا؟"

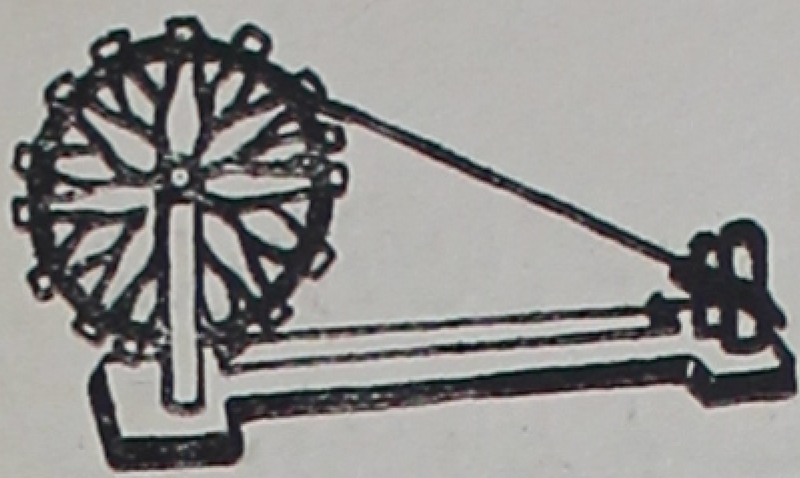
ماں: "ہری اب تم بھوکے ہو گے۔ دوپہر کا کھانا رکھا ہے میں گرم کئے دیتی ہوں تم پہلے کھانا کھا لو پھر باقی کہانی سُن لینا۔"

ہری: "نہیں اماں۔ گھر میں کوئی کھانا نہیں کھائے گا تو میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گا آپ کہانی سُنائے جائیے۔"

ماں: "نہ میرے چاند تھوڑا سا تو کھا لو۔"

ہری: "نہیں اماں مجھے بالکل بھوک نہیں۔ میں تو کہانی سُنوں گا۔"





۷

ماں: "اچھا تمھاری مرضی۔ تو پھر سُنو:۔

"اِدھر تو گاندھی جی ہندوستان کے لوگوں کو بتا رہے تھے کہ دکھنی افریقہ میں ہندوستانیوں کو گوروں کے ہاتھوں کیا دکھ پہنچ رہے ہیں اور اُدھر دکھنی افریقہ کے اخباروں میں یہ سب خبریں بڑھا چڑھا کر چھاپی جا رہی تھیں۔ وہاں کے گورے اِس سے اور بھی چڑ گئے۔ اِن کا بس چلتا تو وہ گاندھی جی کے ساتھ نہ جانے کیا سُلوک کرتے، پر جسے خُدا رکھے اُسے کون چکھے۔ گاندھی جی جہاز سے اترے ہی تھے کہ کچھ فرنگی لڑکوں اور غُنڈوں نے انھیں گھیر لیا اور اُن پر پتھروں، گندے انڈوں، گھونسوں اور لاتوں کی بوچھار شروع کر دی۔ بیچارے گاندھی جی نڈھال ہو کر ایک جنگلے سے لگ کر کھڑے ہو گئے بھگوان کا کرنا اُن کے ایک انگریز دوست کی بیوی اُدھر سے جا رہی تھی کہ اچانک اُس کی نظر گاندھی جی پر پڑی۔ وہ بھیڑ کو چیرتی ہوئی آئی اور اُن کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ جب بھیڑ کم ہوئی تو اِس انگریز عورت نے انھیں اُن کے دوست رُستم جی کے یہاں پہنچا دیا۔ شام کو کچھ فرنگیوں نے



آکر رُستم جی کا گھر گھیر لیا اور ساری
بھیڑ گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے لگی۔
"کھٹّے سیب کے پیڑ پر گاندھی
کو پھانسی دو"
"گاندھی جی کے دوستوں نے
کسی نہ کسی طرح انھیں کسی دوسری
جگہ پہنچا دیا۔
"گاندھی جی چاہتے تو اُن
غنڈوں پر مقدمہ چلا سکتے تھے اور اُن کو سزا بھی دِلوا سکتے تھے۔ پر نہیں، اُنھیں اپنے پِتا جی کا بتایا ہوا پریم کا سبق یاد تھا۔ اُنھوں نے صبر اور برداشت سے کام لیا تاکہ گورے بلوائی اپنے کئے پر آپ پچھتائیں۔ گاندھی جی کی اِس بات کا وہاں کے فرنگیوں پر بڑا اچھا اثر ہوا اور اُن کے دِلوں میں ہندوستانیوں کے لئے تھوڑی سی جگہ ہو گئی۔

"افریقہ میں جب بوئرز اور انگریزوں میں جنگ ہوئی تو گاندھی جی نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ کوئی اور ہوتا تو انگریزوں سے اُن کے بُرے برتاؤ کا بدلہ لیتا پر ایسا ہوتا تو کیسے۔ گاندھی جی کا تو سدا کا اُصول تھا برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اور دشمن کا دِل پریم اور محبّت سے جیت لو۔ اِسی ہتھیار سے کام لے کر

گاندھی جی نے انگریزوں کے دِلوں پر اپنی اور اپنے ساتھ کے افریقہ کے ہندوستانیوں کی سچائی اور نیکی کی گہری چھاپ لگا دی۔

"گاندھی جی کے گھر میں بھگوان کا دیا سب کچھ تھا۔ بیوی، بچے، روپیہ، پیسہ، پر پھر بھی اُن کے دِل کو چین نہ تھا۔ گوتم بدھ کی طرح انھیں بھی دنیا کا عیش و آرام بُرا لگنے لگا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُنھوں نے یہ ٹھان لیا کہ دنیا کا عیش و آرام چھوڑ کر سادہ زندگی میں ہی ان کو سکون مل سکتا ہے۔ یہ طے کرنے کے بعد گاندھی جی نے اپنا سارا کام اپنے آپ کرنا شروع کر دیا۔ کپڑے دھونا، جھاڑو دینا، پاخانہ صاف کرنا، کھانا پکانا۔ یوں ہی دِھیرے دِھیرے سب کام وہ اپنے ہاتھوں سے کرنے لگے۔

"ایک دِن وہ کسی انگریز نائی کی دوکان پر بال کٹوانے گئے۔ تم جانو، اُن دِنوں کالے آدمی سے انگریزوں کو نفرت تو تھی ہی۔ اُس نائی نے گاندھی جی کے بال کاٹنے سے اِنکار کر دیا۔ وہ بے کچھ کہے سُنے گھر لوٹ آئے اور اپنے انگریزی ڈھنگ کے لمبے لمبے بال کاٹ کر چھوٹے کر لیے۔ اِس سے پہلے اُنھوں نے



اپنے بال اپنے ہاتھ سے بھلا کاہے کو کاٹے ہوں گے۔ اِس لئے ایسے چھوٹے بڑے کٹے کہ جیسے سوتے میں چوہے نے کتر لئے ہوں۔ دوسرے دِن جب گاندھی جی کچہری گئے تو ساتھیوں نے خوب ہنسی اُڑائی۔ پر جب اُنھوں نے بتایا کہ کِس طرح تنگ آکر اُنھیں اپنے بال آپ کاٹنے پڑے تو وہ سب چُپ رہ گئے۔ اِس کے بعد گاندھی جی نے انگریزی ڈھنگ کے بال رکھنا چھوڑ دئے اور ہمیشہ اپنے بال آپ کاٹا کرتے تھے۔"

ہری: "اماں! اپنے بال کاٹ کر جب گاندھی جی نے اپنی صورت دیکھی ہوگی تو انھیں بڑی ہنسی آئی ہوگی؟"

ماں: "ضرور، تم نے تو دیکھا تھا وہ کیسے ہنس مکھ آدمی تھے۔

"اچھا تو انگریزوں اور بوئرز کی جنگ کے بعد ۱۹۰۲ء میں جب امن ہوا تو گاندھی جی کو ہندوستان کی یاد ستانے لگی اور یہاں آکر دیس کی سیوا کرنے کی لگن نے اُنھیں گدگدایا۔ سامان بندھنے لگا اور ہندوستان لوٹ چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چلتے وقت گاندھی جی کو افریقہ کے ہندوستانیوں نے اُن کی سیواؤں کے بدلے میں بڑے بڑے قیمتی تحفے دئے اور کستوربا کو ایک ہیروں کا ہار دیا۔ گاندھی جی نے یہ سب چیزیں کانگریس کے دفتر میں جمع کرادیں کہ اُن سے لوگوں کی سیوا ہو سکے۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ جنتا کے سیوکوں کو ایسی چیزوں کے لینے یا رکھنے کا کوئی حق نہیں۔"

"سنہ ۱۹۰۶ء میں جب گاندھی جی ہندوستان لوٹے تو کلکتے میں کانگریس کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ سب ہندوستانیوں کے دلوں کو آزادی کی لگن لگی ہوئی تھی۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ ہندوستانیوں میں آزادی کا جوش تو ہے پر مِل جل کر کام کرنے کی عادت نہیں ہے۔ ہر آدمی اپنا کام دوسروں پر ڈالنا چاہتا ہے اور چھوٹے چھوٹے کام کرنے میں لوگ اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ یہ دیکھ کر گاندھی جی نے کانگریس کے کاموں کا بیڑا اٹھایا اور جلسے میں مہمانوں کے کمروں کی صفائی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اِن کو دیکھ کر اور لوگ بھی اِن کا ہاتھ بٹانے لگے۔ اِس کے بعد مہاتما جی کانگریس سکریٹری کے نیچے منشی کا کام کرنے لگے۔ اُسی جلسے میں اُنھوں نے ہندوستان کے لیڈروں کو افریقہ کے ہندوستانیوں کا حال سنایا اور کانگریس کی ہمدردی حاصِل کی۔

"کانگریس کا جلسہ ختم ہونے پر جب وہ گھر لوٹے تو تیسرے درجے میں آئے وہ دن اور آج کا دن گاندھی جی برابر تیسرے درجے میں ہی سفر کرتے رہے۔ اِس کی وجہ سے ایک تو اُن کا خرچ کم ہوتا تھا، دوسرے غریبوں کے ساتھ بیٹھ کر اُن سے باتیں کر سکتے تھے۔ گاندھی جی کلکتے سے بنارس، آگرہ، جے پور اور پالن پور ہوتے ہوئے راج کوٹ پہنچے اور اِس سارے سفر میں اُنھوں نے صرف اکتیس روپے خرچ کیے۔ وہ سامان بھی بہت تھوڑا

ساتھ لے کر چلتے تھے، اُن کے ساتھ کھانا رکھنے کے لئے ایک ٹین کا کٹوردان ہوا کرتا تھا جو اُنھیں مسٹر گوکھلے نے دیا تھا اور ایک معمولی سے تھیلے میں ایک گرم کوٹ، ایک دھوتی ایک قمیص اور ایک تولیہ"

ہری: "اماں! اُن کے تھیلے میں صابن اور دانت مانجھنے کا برُش تو ہوتا ہی ہوگا۔"

ماں: "نہیں بیٹا وہ اپنے دانت قدرتی برُش سے صاف کرتے تھے جسے داتن کہتے ہیں۔"





۸

"مسٹر گوکھلے جن کا نام میں نے ابھی لیا تھا ہندوستان کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ وہ گاندھی جی کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے تھے۔ اُن ہی کے کہنے پر گاندھی جی نے بمبئی میں پھر بیرسٹری شروع کی۔ ابھی تین چار مہینے ہی ہوئے ہوں گے کہ افریقہ سے پھر بلاوے کے تار آنے شروع ہو گئے۔ وہاں کے ہندوستانی چاہتے تھے کہ افریقہ آکر گاندھی جی انگریز وزیر مسٹر چیمبرلین سے ملیں اور ہندوستانیوں کی شِکایتیں دور کرائیں۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ یہ ایک بڑا کام ہے جِس کے لیۓ ان کا افریقہ جانا ضروری ہے۔ وہ فوراً افریقہ چل دئے، وہاں پہنچ کر اُنھوں نے بیرسٹری چھوڑ دی۔ اور ایک اخبار نِکالا۔ پلیگ کے بیماروں کی دیکھ بھال کی، مزدوروں کی سیوا کر کے اُن کی حالت سُدھاری اور ہندوستانیوں کو برابری کے حق دلانے کے لیۓ اِس بار اُنھوں نے اور زور شور سے کام کیا۔ اِنھیں دنوں گاندھی جی نے من کو پاک کرنے کے لیۓ برت رکھے اور گیتا کے تیرہ باب زبانی یاد کیۓ۔ اُن کے دِل میں یہ اچھی طرح سے جم گیا تھا کہ دنیا کے ٹھاٹ باٹ اور

عیش و آرام چھوڑ کر ہی آدمی بھگوان کے راستے پر چل سکتا ہے۔

"اُنھوں نے سمجھ لیا تھا کہ دنیا کے سب آدمی برابر ہیں۔ نہ کوئی کسی سے چھوٹا ہے نہ بڑا۔ غریبوں میں غریب بن کر اور گھُل مِل کر رہنا چاہیئے اِس لیئے وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا کر بس گئے، وہیں اخبار کا کام شروع کر دیا۔ اور گاؤں والوں کی سی سادی زندگی بسر کرنے لگے۔ گاندھی جی کے انگریز دوستوں پر اُن کی اِن باتوں کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ تین انگریز اِن کے ساتھ اِسی گاؤں میں آکر رہنے لگے۔

"اِنھیں دِنوں ایشیا کے لوگوں کے خِلاف افریقہ میں نئے نئے کڑے قانون بنائے گئے۔ گاندھی جی کی صلاح سے لوگوں نے اِن قانونوں کو توڑنے کے لیئے اِس بار ستیاگرہ شروع کر دیا۔ اہنسا کی لڑائی میں گاندھی جی کا یہی سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ ہندوستانیوں نے سرکار کی گولی اور لاٹھی کا جواب شانتی، اہنسا اور قربانی سے دیا۔ جیل جانا بچوں کا کھیل ہو گیا۔ گاندھی جی ۱۹۰۸ء میں پہلی بار قانون توڑنے کی وجہ سے جیل بھیجے گئے۔ بیس دن کے بعد گاندھی جی کو افریقہ کے بڑے وزیر جنرل اسمٹس نے سمجھوتے کے لیئے پری ٹوریا بلایا۔ گاندھی جی نے یہ شرط رکھی کہ جب میرے سب ساتھی قید سے چھوڑ دیئے جائیں گے تب میں حکومت سے سمجھوتے کی بات چیت کروں گا۔ سب ساتھی چھوڑ دیئے گئے اور جوہانس برگ کی مسجد میں ایک بڑا جلسہ ہوا اور

سب نے مِل کر یہ طے کیا کہ حکومت سے سمجھوتہ ہونا چاہیئے۔ پر کچھ جوشیلے پٹھانوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ یہاں تک کہ ایک پٹھان نے گاندھی جی کو پیٹا جس سے اُن کے سر میں بڑی چوٹ آئی۔"

ہری: "اماں! تو پھر گاندھی جی نے پٹھان کو سزا نہیں دِلوائی؟"

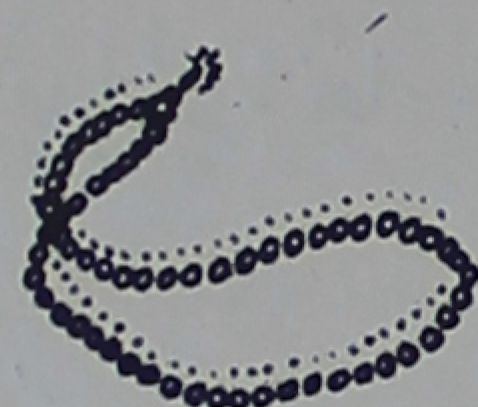
ماں: "نہیں بیٹا اُنھوں نے اِس پر مقدمہ چلانے سے اِنکار کر دیا اور کہا: میرے گھاؤ کی پٹّی سے میرے دشمن بھی میری دوستی کے بندھن میں بندھ جائیں گے، اور بیٹا، سچ مچ ایسا ہی ہوا۔ جب اُس پٹھان نے یہ سُنا تو وہ اپنے کئے پر بہت پچھتایا، گاندھی جی سے معافی مانگی اور ہمیشہ کے لئے اُن کا دوست بن گیا۔

"۱۹۱۴ء میں دنیا میں چاروں طرف لڑائی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چار اگست کو اِنگلستان نے جرمنی سے لڑائی کا اعلان کر دیا۔ اور بڑے زوروں سے جنگ چھڑ گئی۔ گاندھی جی نے اب یہ سوچا کہ اِن دنوں میرے دیس کو میری سیوا کی ضرورت ہوگی۔ وہ پہلے افریقہ سے لندن گئے اور پھر کچھ دِنوں وہاں رہ کر ہندوستان آئے۔ ۹ جنوری ۱۹۱۵ء کو وہ بمبئی پہنچے۔ اُس وقت وہ ہندوستانی مِل کے بنے ہوئے کپڑے کا کاٹھیا واڑی کوٹ، پگڑی اور دھوتی پہنے ہوئے تھے۔"

ہری: "کوٹ پہن کر وہ بڑے اچھے لگتے ہوں گے۔ پھر اُنھوں نے یہ کپڑے پہننا کب اور کیوں چھوڑ دیا؟"



ماں: ”ہاں اچھے تو لگتے ہی تھے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں
جب اُنھوں نے دیکھا کہ دیس میں بہت
سے غریبوں کو کوٹ کیا کُرتا بھی پہننے
کو نہیں ملتا تو انھوں نے وہی پہننا
شروع کر دیا جو ہندوستان کا
غریب سے غریب آدمی پہنتا ہے تب
ہی سے وہ ایک چھوٹی سی دھوتی پہننے
لگے اور کرتے اور کوٹ کی جگہ کبھی کبھی
چادر اُوڑھ لیتے تھے۔





۹

"سنہ ۱۹۱۵ء میں گاندھی جی نے مسٹر گوکھلے کی رائے سے گجرات میں ایک چھوٹے سے گاؤں کوچرب میں ایک آشرم کھولا۔ آشرم کے ہر ممبر کو یہ قسم کھانی پڑتی تھی کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا، اہنسا کو مانوں گا، سادہ کھانا کھاؤں گا، چوری نہیں کروں گا، اپنے لئے روپیہ پیسہ جمع نہیں کروں گا، کسی سے ڈروں گا نہیں، سودیشی چیزیں برتوں گا، ہاتھ کا کتا اور ہاتھ کا بُنا کھدر پہنوں گا، ہندوستانی بولی میں علم پھیلانے اور چھوت چھات دور کرنے کی کوشش کروں گا۔

"کوچرب آشرم میں اچھوت ذات کے لوگ اور اونچی ذات والے سب ایک ساتھ رہتے سہتے، اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے تھے۔ وہاں سب لوگ برابر تھے کوئی کسی سے اونچا یا نیچا نہ تھا۔ پہلے پہلے تو آشرم والوں کو یہ چیز کچھ عجیب سی لگی، پر دھیرے دھیرے عادت ہو گئی۔ ہمارے دیس میں اِس سے پہلے ایسی بات بھلا کاہے کو ہوئی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اِسے بُرا سمجھا یہاں تک کہ امیر لوگوں نے روپے پیسے سے آشرم کی مدد کرنا بند کردی۔ ایک دن جب گاندھی جی کو پتہ چلا کہ آشرم کو چلانے لئے ایک کوڑی بھی

نہیں رہی تو وہ بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ شام کے وقت وہ اُداس سے بیٹھے تھے اور حیران تھے کہ کیا کریں۔ اِتنے میں ایکا ایکی ایک اجنبی آدمی آشرم میں آیا اور گاندھی جی کو ۱۶ سولہ ہزار روپے دے کر چلا گیا۔ سچ ہے ایشور کے سچے بھگتوں اور اللہ والوں کے لئے اِس طرح سامان پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔

"گاندھی جی کے کام، اُن کی سچائی، اُن کی نیکی اور اُن کی قربانی کو دیکھ کر رابندناتھ ٹیگور نے اُنھیں مہاتما کہنا شروع کر دیا اور سارا دیس اُنھیں مہاتما کے نام سے پکارنے لگا۔ مہاتما جی جہاں جاتے سینکڑوں ہزاروں لوگ اُن کے درشن کو آتے، اُن کے پاؤں چھوتے اور اُن کے ہاتھ چومتے تھے۔

"اِس وقت دیس میں انگریزوں سے نفرت بڑھتی جا رہی تھی اور لوگ اُن سے تنگ آچکے تھے۔ مہاتما جی چاہتے تھے کہ ہمّت اور جوش تو قایم رہے پر کسی طرح نفرت دلوں سے دُھل جائے۔ وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ انگریز کی حکومت سے ٹکر لینا کوئی کھیل نہیں۔ اِس کے لئے اُن کو ساری جنتا کو ساتھ لینا ہوگا۔ بس اُنھوں نے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے لئے اپنے آپ کو تج دیا اور اُن کی حالت سدھارنے کے لئے سب طرح کی کوشِش کرنے لگے۔

"اِنگلستان اور جرمنی کی لڑائی اُن دنوں زوروں پر تھی اور انگریز کو اِس

لڑائی میں ہندوستانیوں کی مدد کی بڑی ضرورت تھی۔ اُنھوں نے گاندھی جی کو تیار کر لیا کہ وہ اُن کی مدد کریں۔ کوئی دوسرا ہوتا، تو انگریزوں کا برتاو ہندوستانیوں کے ساتھ دیکھتے ہوئے کبھی انگریزوں کی مدد نہ کرتا۔ پر گاندھی جی کا اصول تھا کہ دشمن کی مُصیبت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے، پھر وہ بھلا انگریز کی مُصیبت سے فائدہ کیسے اُٹھاتے۔ وہ تو اُن پر احسان کا بوجھ ڈال کر ہندوستان کو اُن کے ہاتھوں سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ دوسرے گاندھی جی یہ بھی سمجھتے تھے کہ انگریز جو ظلم ہم پر کرتے ہیں وہ اِس قوم کی گھٹی میں نہیں بلکہ کچھ گھٹیا انگریز افسروں کی، جو ہندوستان میں آکر راج کرتے ہیں، بھول اور ناسمجھی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے، اور ہم انگریز قوم کو اپنی محبت سے موہ سکتے ہیں۔ اِسی لئے گاندھی جی خود گاؤں گاؤں گئے اور لوگوں سے فوج میں بھرتی ہونے کو کہا۔ اِس کام میں اُنھوں نے نہ دن دیکھا نہ رات، اِتنی جان کھپائی کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ ابھی بیمار ہی تھے کہ خبر آئی لڑائی ختم ہو گئی اور ساتھ ہی بھرتی کا کام بھی بند ہو گیا۔ اِسی بیماری میں گاندھی جی نے بکری کا دودھ پینا شروع کیا اور مرتے دم تک اُبلی ہوئی ترکاریاں اور بکری کے دودھ پر بسر کرتے رہے۔"

ہری: "لڑائی بند ہو جانے سے مہاتما جی اور دیس کے سب لوگ بہت خوش ہوئے ہوں گے۔"





۱۰

ماں: "ہاں! اِس کی خوشی تو ضرور ہوئی کہ دنیا میں مار کاٹ بند ہو گئی، پر ہمارے ملک
کا اُس وقت عجیب حال تھا۔ لڑائی بند ہونے پر سب لوگ سمجھتے تھے کہ اب امن،
چین، ترقی اور خوش حالی کے دن آئیں گے۔ ہم نے انگریزوں کے لئے جو
قربانیاں کی تھیں اُن کے بدلے میں ہمیں تھوڑی بہت آزادی ملے گی۔ پر کِس
کی آزادی اور کیسی شانتی! انگریزوں نے تو ہم پر پہلے سے زیادہ سختیاں کرنی
شروع کر دیں۔ ایسے نئے نئے قانون بنائے جن سے وہ ہمارے بڑے
سے بڑے لیڈروں کو چھوٹی چھوٹی بات پر پکڑ کر جیل میں ٹھونس سکتے تھے۔ پھر
کیا تھا، ایسا اندھیر دیکھ کر کلکتے سے کراچی اور کشمیر سے راس کماری تک غصّے
اور جوش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ملک کے کونے کونے میں جلسے ہوئے،
تقریریں ہوئیں اور ہمارے ملک کا بچّہ اور بوڑھا، مرد اور عورت، ہندو اور مسلمان
قانون توڑنے اور دیس کے لئے جان کی بازی لگانے پر تُل گئے۔

"مہاتما گاندھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے پریم کی جوت جگا کر
اندھیرے گھر میں اجالا کر دیا۔ سارے دیس کے لوگوں نے ایک زبان ہو کر



انگریز سے سوراج مانگنا شروع کیا، گاندھی جی سب کے
لیڈر بنے۔ اُنھوں نے سب سے پہلی شرط یہ لگائی کہ
انگریزی راج سے لڑنے میں صرف اہنسا اور شانتی
سے کام لیا جائے، مارپیٹ کا نام تک نہ ہو۔ مسلمان
اور ہندو کندھے سے کندھا جوڑ کر انگریز سرکار سے لڑنے
کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مہاتما گاندھی نے ایک دِن
ایسا رکھا جب دیس کے چپے چپے میں ہڑتال کی گئی، سب کاروبار بند ہو گئے
مسلمانوں نے روزے اور ہندوؤں نے برت رکھے۔ مندروں، مسجدوں اور
گوردواروں میں دعائیں مانگی گئیں کہ بھگوان ہمارے دیس کو آزاد کرا دے۔

"ہڑتال کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی۔ بھلا انگریزوں کو یہ بات کیسے اچھی
لگتی، اُنھوں نے ہمیں دبانے کے لئے ہم پر طرح طرح کے ظلم کرنا شروع
کئے۔ امرتسر میں جلیان والا باغ میں جلسہ کرنے والوں پر جنرل ڈائر نے
گولی چلانے کا حکم دیا۔ سینکڑوں نہتے مرد، عورت، بچے، جوان اور بوڑھے
تھوڑی دیر میں بھون ڈالے گئے۔ پنجاب بھر میں ہزاروں کو جیلوں میں ٹھونس
دیا گیا۔

"ڈاک، ریل، تار سب بند تھے۔ پنجاب کی خبر مہاتما گاندھی تک پہنچے
تو کیسے پہنچے۔ پر ایسی بات بھلا کب تک چھپ سکتی تھی۔ تھوڑے دن بعد

کسی نہ کسی طرح پنجاب کی بپتا کی خبر مہاتما جی تک پہنچ ہی گئی۔ یہ دُکھ بھری کہانی سُن کر اُن کا دِل بھر آیا۔ تڑپ کر پنجاب والوں کی مدد کے لئے چل نکلے۔ وہ امرتسر پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ راستے ہی سے سرکار نے اُن کو پکڑ کر لوٹا دیا اور وہ پھر بمبئی پہنچا دئے گئے۔

"انگریزی راج کا سارا بَل مہاتما گاندھی کو دبانے پر تلا ہوا تھا۔ پر اُس سختی سے مہاتما جی کی ہمت نہ ٹوٹی۔ بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ نڈر ہو کر کام کرنے لگے۔ وہ اِس دیس میں سب جاتیوں کو ایک کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ اُن کی محنت پھل لائی اور بڑے بڑے مسلمان لیڈر ہندو لیڈروں کے ساتھ ایک ہی جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

"اِن دونوں جاتیوں کو ایک کرنے کے بعد بھی بہت سا کام باقی تھا۔ سچّی آزادی حاصِل کرنے کے لئے ابھی اور تیاریاں ضروری تھیں۔ مہاتما جی نے کمزوروں کے دِل سے زبردست کا ڈر، غریب کے دل سے امیر کا ڈر، کسان کے دِل سے زمیندار کا ڈر، ہری جن کے دل سے برہمن کا ڈر، اور ہندوستانی کے دِل سے انگریز کا ڈر نکالنے کے لئے جتن کرنا شروع کئے۔ وہ بار بار پکار پکار کر کہتے تھے کہ لوگوں کے دِلوں سے ہر طرح کا ڈر نکالنے اور اِنھیں آزاد کرانے کے لئے سچّائی اور اہنسا سب سے زیادہ ضروری ہیں۔



"آج سے دو ہزار برس پہلے
گوتم بدھ نے ہندوستانیوں کو
اہنسا کا سبق پڑھایا تھا۔ پر اُسے
ہم بھول چکے تھے۔ مہاتما جی نے
پھر وہی سبق دہرایا کہ کسی کی جان
لینا سب سے بڑا پاپ ہے اور
یہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتایا کہ ہمیں ملک
کی آزادی اور اپنی آزادی کے لئے لڑنا چاہیئے
پر یہ لڑائی خونی ہتھیاروں سے نہیں
لڑی جائے گی، بلکہ شانتی سے لڑی
جائے گی۔ ہندوستانی سو چکے تھے۔ مہاتما جی نے ہمیں جھنجھوڑ کر جگایا۔
انھوں نے اپنے ایلچی گاؤں گاؤں بھیجے کہ جنتا اپنے آپ کو آزاد کرانے کے
لئے تیار ہو جائے۔ اِسی کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ
لوگ پڑھنا، لکھنا، چرخہ کاتنا اور کپڑا بننا سیکھیں۔ چھوت چھات چھوڑ دیں اور
شراب پینا بند کر دیں۔ مہاتما جی جو کچھ دوسروں سے کرانا چاہتے تھے وہ
پہلے خود کرتے تھے۔ اِسی لئے اُنھوں نے چرخہ کاتنا سیکھا اور تھوڑے ہی
دن میں وہ دونوں ہاتھوں سے کاتنے لگے۔

"ابھی مہاتما جی ہندوستان کو جگا کر ہوشیار کر ہی رہے تھے کہ اِتنے میں سُنا کہ انگلستان کے بادشاہ کا بڑا بیٹا ہندوستان آرہا ہے۔ اُس وقت لوگ کسی طرح اِس کا سواگت کرنے کو تیار نہ تھے۔ اِن کو انگریز سرکار سے بڑی شکایت تھی کہ وہ اِن پر رعب جمانے کے لئے بادشاہ کے بیٹے کو یہاں بُلا رہی ہے۔ سب نے طے کیا کہ وہ جلسے یا جلوس میں شامِل نہ ہوں گے۔ ایک طرف تو بادشاہ کے بیٹے کی سواری بمبئی کے سجے ہوئے پر سنسان، بازاروں میں سے نکل رہی تھی اور دوسری طرف لوگ بدیشی کپڑوں کے ڈھیر لگا لگا کر اُنھیں آگ لگا رہے تھے۔ اِس لئے کہ سودیشی مال کے پرچار کا اِن دنوں بڑا زور تھا۔

"یہ سب کچھ بڑی شانتی کے ساتھ ہو رہا تھا کہ ایک دم کچھ سرپھِروں نے جوش میں آکر احمد آباد اور بمبئی میں مار دھاڑ شروع کردی۔ کچھ انگریزوں پر پتھر برسائے، جن پارسیوں نے بادشاہ کے بیٹے کے سواگت میں حصّہ لیا تھا اُن کو پیٹا، ٹرام گاڑیاں توڑ ڈالیں اور شراب کی دوکانوں میں گھُس کر توڑ پھوڑ کی۔ جب مہاتما جی کو اِس کی خبر لگی تو وہ خود موٹر میں بیٹھ کر بمبئی میں جگہ جگہ گئے۔ ایک جگہ انھوں نے دیکھا کہ دو گھائل پولیس والے چارپائیوں پر بے ہوش پڑے ہیں۔ جیسے ہی مہاتما جی موٹر سے اترے، بھیڑ نے اُنھیں گھیر لیا اور ہر طرف سے "مہاتما گاندھی کی جے" پکاری جانے لگی۔ اپنے نام پر لوٹ مار

اور تباہی دیکھ کر اُن کے دل کو چوٹ لگی۔ اُنھوں نے لوگوں کو بُرا بھلا کہا اور سمجھایا کہ اِس ڈھنگ سے حکومت سے لڑنا گاندھی اور اہنسا دونوں کی ہار ہے۔ اُنھوں نے کہا میں کبھی ایسی آزادی نہیں چاہتا جو ہنسا کے بعد ہاتھ لگے۔ جب لوگوں نے یہ سُنا تو وہ اپنے کیے پر بہت پچھتائے۔ گاندھی جی نے گھائل سپاہیوں کو وہاں اسپتال پہنچا دیا۔ ابھی گاندھی جی لوگوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کرنے ہی پائے تھے کہ خبر آئی، شہر کے کسی دوسرے حصّے میں ایک جلوس پر پولیس نے گولیاں برسائیں۔ اِس خبر کا سننا تھا کہ شہر میں ہل چل مچ گئی۔ جگہ جگہ لوگوں نے دوکانیں توڑیں، گاڑیاں جلائیں اور جو نہ کرنا تھا وہ کیا۔

"گاندھی جی نے جب دیکھا کہ لوگ آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں تو اُنھوں نے برت رکھنے کی ٹھانی اور کہا 'میں لوگوں کے کیے کی سزا خود بھگتوں گا اور جب تک وہ ہندو اور مسلمان جنھوں نے اہنسا کا اصول توڑا ہے جا کر اُن پارسی، عیسائی اور یہودی بھائیوں سے جن کو ہمارے ہاتھوں دُکھ پہنچا ہے معافی نہیں مانگیں گے میں اپنا برت نہیں کھولوں گا'۔

"جو کچھ مہاتما جی چاہتے تھے وہی ہوا۔ سب پارٹیوں کے لیڈر مل کر اُن کے پاس آئے اور اِن کو یقین دِلایا کہ مار پیٹ کرنے والوں نے ایک ایک سے معافی مانگی ہے اور جِن کو دکھ پہنچا تھا اُنھوں نے بھی معاف کر دیا ہے۔ تب کہیں جا کر گاندھی جی نے اپنا برت کھولا۔ اُسی دن سے گاندھی جی نے

عہد کیا کہ جب تک ہندوستان کو سوراج نہیں ملے گا وہ ہر سوموار کو مون برت رکھا کریں گے۔"

ہری: "اماں! مہاتما جی ہر سوموار کو مون برت کیوں رکھتے تھے؟"

ماں: "اُس سے مہاتما جی کو بڑا آرام ملتا تھا۔ اُنھیں سوچنے سمجھنے کے لئے چوبیس گھنٹے مل جایا کرتے تھے اور اُسی دن وہ اپنے اخبار کے لئے مضمون بھی لکھتے تھے۔"





۱۱

"گاندھی جی سوچ رہے تھے کہ اہنسا کی لڑائی کو جاری رکھیں یا چھوڑ دیں۔ بمبئی کا حال دیکھ کر اُن کو یہ ڈر تھا کہ کہیں لوگ جوش میں آکر پھر مار پیٹ شروع نہ کردیں۔ پر جب اور شہروں سے خبریں آئیں کہ وہاں ستیاگرہ اور ہڑتالیں بالکل شانتی سے ہوئیں تو اُن کی ہمت بندھی اور وہ اہنسا کی لڑائی جاری رکھنے کو تیار ہو گئے۔

"ہڑتالوں کے بعد بہت سے لوگوں نے بدیشی مال خریدنا چھوڑ دیا، جس سے انگلستان کے کارخانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ سرکار نے اس تحریک کو دبانے کے لئے ہمارے بڑے بڑے لیڈروں جیسے پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو چترنجن داس، لالہ لاجپت رائے، مولانا آزاد اور سینکڑوں دیش بھگتوں کو پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس دیا۔

"کوئی اور ہوتا تو اُس کا جی چھوٹ جاتا اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا پر گاندھی جی آزادی کا جھنڈا مضبوطی سے تھامے ڈٹ کر سرکار سے مقابلہ کرتے رہے۔ اُنھوں نے بار بار وائسرائے سے کہا کہ وہ ہمارے لیڈروں کو چھوڑ دیں

پروا نہ کرتے اِس پر تیار نہ ہوتے۔

"آزادی کی لڑائی زوروں پر تھی معلوم ہوتا تھا کہ جیت ہماری ہی ہوگی کہ ایکا ایکی خبر آئی کہ مہاتما جی نے لڑائی روک دی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ بات کیا ہے۔ کوئی کہتا کہ مہاتما جی انگریزوں سے ڈر گئے۔ کوئی کہتا انگریزوں سے سمجھوتہ کرلیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ پر سمجھ دار لوگ جان گئے کہ اصلی بات کیا ہے؟"

ہری: "اماں! وہ اصلی بات کیا تھی۔ مہاتما جی نے لڑائی کیوں روکی؟"

ماں: "بات یہ تھی، مہاتما جی نے جب دیس کی آزادی کی لڑائی شروع کی تو بار بار اہنسا کا سبق دہرایا۔ وہ جانتے تھے کہ اتنی بڑی سرکار سے لڑنا آسان کام نہیں۔ جب لوگ سرکار کا مقابلہ کریں گے تو سرکار لوگوں کو سزا ضرور دے گی۔ پولیس اُن پر لاٹھیاں برسائے گی، گولی چلائے گی۔ ایسے میں شانت رہنا ہی تو اہنسا کی سچی پہچان ہوگی۔ دیس میں جگہ جگہ لوگ قانون توڑ رہے تھے اور جواب میں چُپ چاپ لاٹھیاں کھا رہے تھے۔ پر یو پی میں گورکھپور ضلع کے گاؤں چوری چورا میں کچھ جوانوں نے مار پیٹ کا جواب مار پیٹ سے دیا اور ایک پولیس چوکی کو آگ لگادی۔ اس میں کئیں پولیس والے جل کر مر گئے۔ لوگوں کی اِس حرکت پر مہاتما جی کو بڑا دُکھ ہوا اور اُنھوں نے اُسی دم لڑائی بند کرنے کا حکم دے دیا اور کہا: 'جو آزادی کسی آدمی کی جان لے کر یا کسی کو دکھ دے کر ملے وہ کسی کام کی نہیں ایسی آزادی سے غلامی ہزار گنا اچھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بھول

مجھ ہی سے ہوئی ہے ۔ دیس کے لوگ ابھی اہنسا کا سبق پوری طرح پڑھ نہیں پائے ۔ جب تک وہ اہنسا کو اصلی روپ میں نہیں پہچانیں گے تب تک ستیاگرہ نہیں کر سکتے ۔ ستیاگرہ کے لئے نرمی ، سچائی ، صبر ، سمجھ داری ، برداشت اور دوست دشمن سے پریم ضروری ہے ۔

" خود اپنی بھول اور اپنے ملک والوں کی بھول کو کھلّم کھلّا مان لینے ہی پر گاندھی جی نے بس نہیں کی ۔ اُنھوں نے ساتھ ہی ساتھ پانچ دن کا برت بھی رکھا اور بمبئی سے سابرمتی آشرم لوٹ آئے ۔ وہاں سے وہ اہنسا کا پرچار ملک بھر میں کرنا چاہتے تھے ۔ ابھی وہ سابرمتی آشرم پہنچے ہی تھے کہ چوتھے دن سرکار نے انھیں پکڑ لیا اور کستوربا نے اُن کی طرف سے دیس والوں کو سندیسہ بھجوایا کہ سب لوگ بدیشی کپڑے چھوڑ کر سودیشی کپڑا پہنیں ، چرخہ کاتیں ، چھوت چھات چھوڑ دیں اور دیس سُدھار کا کام کریں ۔

" گاندھی جی نے جیل کی سب سختیاں ہنس ہنس کر جھیلیں ۔ روز سویرے اُٹھ کر گیتا پڑھتے ، دوپہر کو قرآن اور شام کو ایک چینی عیسائی کے ساتھ انجیل پڑھا کرتے ۔ چرخہ کاتتے اور جو وقت بچتا اُس میں اردو اور تامل لکھنا پڑھنا سیکھتے ۔

" گاندھی جی یوں تو ہماری آنکھوں سے اوجھل تھے مگر ہمارے دِلوں میں اُن کی یاد ہردم رہتی تھی ۔ اُنھیں جیل گئے دو برس بھی نہ بیتے تھے کہ وہ بہت بیمار ہو گئے ۔ اُن کی بیماری کی خبر سُن کر سارے دیس میں ہل چل مچ گئی ۔ چھ مہینے

بیمار رہنے کے بعد جب سرکار نے اِن کے اچھے ہونے کی کوئی اور صورت نہ دیکھی، تو انھیں پونا کے سرکاری اسپتال میں بھیج دیا۔ وہاں ایک بڑے ڈاکٹر نے اِن کا اپنڈکس کا اپریشن کیا۔ کچھ دن بعد جب یہ معلوم ہوا کہ اب وہ بچ جائیں گے تو کچھ نہ پوچھو، ہندوستان والے کتنے خوش تھے!

" فروری کا مہینہ شروع ہوتے ہی خبر ملی کہ سرکار نے گاندھی جی کو جیل سے چھوڑ دیا ہے۔ گاندھی جی نے جیل سے نکلتے ہی مولانا محمد علی کو، جو اِن دنوں کانگریس کے پریذیڈنٹ تھے، چٹھی لکھی کہ اِس طرح کی رہائی سے مجھے بالکل خوشی نہیں اور جب تک چھ سال پورے نہیں ہو جائیں گے میں جیل سے باہر ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو سرکار کا قیدی ہی سمجھوں گا اور آزادی کی لڑائی میں سرکار سے کوئی ٹکر نہیں لوں گا۔

"پونا کے اسپتال سے گاندھی جی کو بمبئی کے پاس سمندر کے کنارے جوہو بھیج دیا گیا۔ یہاں گاندھی جی دھیرے دھیرے اچھے ہونے لگے۔ اِن کے پاس آزادی کے متوالے پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو چترنجن داس اور پنڈت جواہر لال سب آتے۔ گاندھی جی اُن سب سے گھنٹوں بیٹھ کر سوراج کی باتیں کرتے، اور اب تو یہ بات گاندھی جی کے دل میں گھر کر گئی تھی کہ جب تک اِس ملک سے غریبی، جہالت، چھوت چھات اور پھوٹ دور نہیں ہوگی، تب تک یہ ملک آگے نہیں بڑھ سکتا اور سدا اسی طرح غلامی میں جکڑا رہے گا۔

”اچھا ہوتے ہی گاندھی جی نے ہندوستان کی حالت سدھارنے کے لئے ان تھک کوشش شروع کر دی ۔ جگہ جگہ لوگوں کو سوت کاتنا اور کپڑا بننا سکھایا جانے لگا تاکہ لوگ بدیشی کپڑا پہننا چھوڑ دیں ۔ شراب بند کرنے اور چھوت چھات کو مٹانے کی کوششیں ہونے لگیں اور آپس کی پھوٹ دور کرنے کے لئے گاندھی جی دوڑ دھوپ کرنے لگے ۔

”گاندھی جی نے جو کچھ کہا تھا، وہی کیا اور سرکار سے کوئی ٹکر نہ لی ۔ پھر بھی سرکار کو ڈر تھا کہ اگر کہیں ہندو، مسلم، سکھ، پارسی اور عیسائی ایک ہی جھنڈے تلے آ گئے تو بڑی سے بڑی سرکار بھی ان کے سامنے نہ جم سکے گی ۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ سرکاری افسروں نے گاندھی جی کی کوششوں کو ملیا میٹ کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں، دونوں کو بہکایا اور ان میں پھوٹ ڈلوانے کی چالیں چلنا شروع کر دیں ۔“

ہری : ”اماں! پر ہندو اور مسلمان ان بُرے افسروں کے کہے میں کیوں آ گئے ؟“



۱۲

ماں : " ہری بیٹا! یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ نفرت اور پھوٹ کا سبق پڑھنا کتنا آسان ہے اور میل محبت اور پریم کرنا کتنا کٹھن ۔ مورکھ ہندو اور مسلمان بھی اپنے راستے سے بھٹک گئے اور گاندھی جی کا پریم سندیسہ بھلا کر ایک دوسرے سے لڑنے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں آزادی کی منزل آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

" ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خون بہاتے دیکھ کر مہاتما جی کے دکھ کی کوئی حد نہ رہی ۔ دلّی میں جب ہندو اور مسلمانوں میں لڑائی ہوئی تو مہاتما جی دلّی پہنچے ۔ وہاں انھوں نے اکیس ۲۱ دن کا کٹھن برت رکھا ۔ وہ اپنے برت سے اور دعاؤں سے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے پریم پیدا کرنا چاہتے تھے ۔

" برت کے گیارہ دن تو لوگوں نے کسی نہ کسی طرح گزار دئے ۔ پر جب بارھویں دن ڈاکٹروں نے کہا کہ اگر گاندھی جی اب اپنا برت نہیں کھولیں گے تو ان کی جان کا ڈر ہے ۔ تو یہ خبر سنتے ہی سارے ملک پر جیسے اندھیرا چھا گیا ۔ سب دوست اور ڈاکٹر مل کر گاندھی جی پر دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ برت کھول دیں ۔ اس روز گاندھی جی

کا مَون برت بھی تھا۔ اس لئے انھوں نے ایک پرچے پر لکھ دیا "بھگوان پر بھروسہ رکھو، پرارتھنا میں بڑی شکتی ہے" وہ رات بڑی بھیانک رات تھی سب لوگ تمام وقت جاگتے اور خدا سے گڑگڑا گڑگڑا کر مہاتما جی کی زندگی کے لئے دعائیں مانگتے رہے۔"

ہری: "امّاں اتو کیا بھگوان نے دعائیں سُن لیں؟"

ماں: "ہاں اُس نے ہماری دعائیں سن لیں اور سویرا ہونے پر خبر ملی کہ مہاتما جی کی طبیعت پہلے سے بہت اچھی ہے۔ اکیس [۲۱] دِن پورے ہونے پر جب گاندھی جی نے اپنا برت کھولا تو وہ بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔

"اس دن گاندھی جی کے سب دوست صبح چار بجے پرارتھنا کے لئے اُٹھے۔ دوپہر کے بارہ بجے گاندھی جی اپنا برت کھولنے والے تھے پہلے قرآن پڑھا گیا، پھر ایک عیسائی دوست نے ایک گیت گایا، پھر گیتا پڑھی گئی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے سنترے کے رَس سے اپنا برت کھولا۔

"سب ہندو اور مسلمان نیتا، پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو چترنجن داس مولانا آزاد، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور سوامی شردھانند جو وہاں موجود تھے انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہندوؤں مسلمانوں کو ایک کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ گاندھی جی کے برت کی وجہ سے بہت دنوں تک ہندو اور مسلمان ایک رہے۔

"یہ دیکھ کر گاندھی جی نے دوسرا کام ہاتھ میں لیا اور چھوت چھات دور کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ انھیں دنوں ٹراونکور کے برہمن، ہریجنوں کو خاص خاص سڑکوں پر چلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ جب گاندھی جی نے یہ سُنا تو وہ فوراً ٹراونکور پہنچے اور انھوں نے اپنے ستیاگرہ کے پرانے ہتھیار کو کام میں لاکر، سب سڑکیں ہریجنوں کے لئے کھُلوا دیں۔

"اِسی زمانے میں گجرات کے کھیڑا ضلع میں کِسانوں اور سرکار سے لڑائی چھڑ گئی۔ جب گاندھی جی کو پتہ چلا کہ سرکار کسانوں پر ظلم کر رہی ہے تو انھوں نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کو کِسانوں کا نیتا بنا کر بھیجا۔ سردار صاحب نے اپنی ہوشیاری اور ان تھک کوششوں سے سرکار کے چھکّے چھڑا دئے اور کِسانوں کے لئے کھیڑا کا میدان جیت لیا۔

"ملک میں بے چینی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ سارا دیس مہاتما گاندھی کے جے کاروں سے گونج رہا تھا۔ ہندوستان کو پوری آزادی دِلوانے کے لئے لوگ جان دینے اور جیلوں میں جانے کے لئے بے چین تھے۔

"یوں تو مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۱ء میں ہی ترنگے جھنڈے کو اپنا قومی جھنڈا مان لیا تھا پر ۱۹۳۱ء کانگریس نے اسے اپنا قومی جھنڈا بنا لیا۔

"اس جھنڈے میں سب سے اوپر کیسری رنگ بہادری کا، بیچ کا سفید پوِترتا یا پاکیزگی کا، اور نیچے کا ہرا رنگ امن، چین اور خوش حالی کا نشان

ہے۔ چرخہ محنت مزدوری کی عزت کرنا سکھاتا ہے۔ یہ جھنڈا کسی الگ دین یا دھرم کا نہیں بلکہ سب کا ہے۔ اِس جھنڈے کی عزت کرنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔

"ملک کے لوگ آزادی پانے کے لئے بے چین تھے مگر انگریز بار بار ہماری اِس مانگ کو ٹھکراتے رہے۔ اِسی وجہ سے گاندھی جی قانون توڑ کر سرکار کے خلاف ستیاگرہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ کوئی ایسا قانون توڑنا چاہتے تھے جس کے توڑنے سے جنتا کا فائدہ ہو۔ نمک ایک ایسی چیز ہے جو امیر غریب سب کے کام میں آتی ہے اور سمندر کے پانی سے اور بعض جگہ کی مٹی سے بھی جو چاہے نمک بنا سکتا ہے۔ پر سرکار نے ایسا قانون بنا رکھا تھا کہ سوائے سرکار کے کسی اور کو نمک بنانے کی اجازت نہیں تھی اور سرکار جتنا چاہتی اتنا ٹیکس وصول کرتی تھی۔ مہاتما جی کا خیال تھا کہ اس ٹیکس کا بوجھ امیروں سے زیادہ غریبوں پر پڑتا ہے۔ اِسی لئے انُھوں نے سب سے پہلے نمک ہی کے قانون کو توڑنے کی تیاری کی اور گجرات میں ڈانڈی جا کر نمک بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سدھارنے سے پہلے انُھوں نے برت رکھا اور اوناسی ساتھیوں کو لے کر اپنے سابرمتی آشرم سے پیدل روانہ ہوئے۔ گاندھی جی آگے آگے اور اُن کے ساتھی تین تین کی قطار میں پیچھے پیچھے تھے۔ ہر ایک ستیا گرہی کے کاندھے پر ایک لاٹھی میں لٹکی ہوئی ایک چھوٹی سی گٹھری تھی۔ جہاں

جہاں مہاتما جی جاتے وہاں وہاں لوگ اُن کے درشن کو آتے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ کرتے۔ پھول اور ناریل لاتے۔ مہاتما جی جگہ جگہ رُکتے، تقریریں کرتے اُپدیش دیتے بارہ مارچ کے چلے ہوئے پانچ اپریل کو ڈانڈی پہنچے۔ ڈانڈی گجرات کی ایک بندرگاہ ہے جو احمد آباد سے دو سو میل پر ہے۔

"جب مہاتما جی نے قانون توڑ کر نمک بنایا تو ایسا معلوم ہوا کہ دیس بھر سوتے سے جاگ اٹھا۔ جگہ جگہ لوگوں نے شانتی کے ساتھ قانون توڑ کر نمک بنانا شروع کیا اور سرکار نے اتنی ہی سختی کے ساتھ انھیں سزائیں دینا شروع کیں۔

"چار مئی کی رات کو ایک بجے ہتھیار بند پولیس نے آکر گاندھی جی کی جھونپڑی کو گھیر لیا۔ گاندھی جی اور سب ستیا گرہی بے خبر سو رہے تھے کہ پولیس کا ایک انگریز افسر گاندھی جی پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے بولا: 'کیا آپ ہی موہن داس کرم چند گاندھی ہیں؟' گاندھی جی نے کہا 'کیا آپ مجھے لینے آئے ہیں؟ ٹھہریئے، میں ابھی آتا ہوں، ذرا منہ ہاتھ دھولوں تو آپ کے ساتھ چلتا ہوں' گاندھی جی نے دانت مانجھے منہ ہاتھ دھویا اور پولیس کا افسران کی گٹھری ہاتھ میں لیئے کھڑا رہا۔ منہ دھونے کے بعد گاندھی جی نے کہا: 'مہربانی کر کے مجھے چند منٹ پرارتھنا کے لیئے اور دے دیجیے' گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں نے مل کر بھجن گائے اور پرارتھنا کی۔ سب نے ایک ایک کر کے مہاتما جی کو پرنام کیا۔

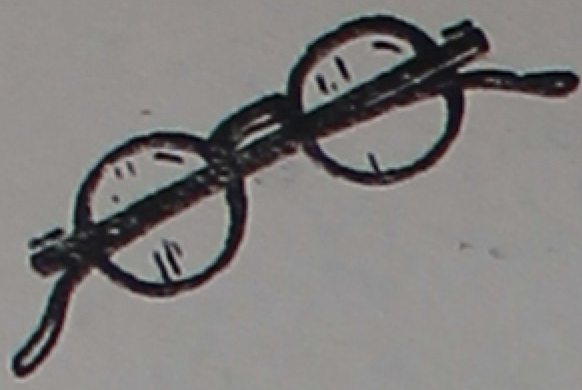
ایک پولیس والے نے کھدّر کے دو چھوٹے تھیلے اٹھائے، جس میں گاندھی جی کی ضرورت کی چیزیں تھیں۔ پھر آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے پولیس والے سب لاری میں بیٹھ گئے۔ یوں رات میں، چوروں کی طرح پولیس والے آئے اور ہمارے گاندھی بابا کو اٹھا کر لے گئے۔"

ہری: "تو انھوں نے شور کیوں نہ مچا دیا، لوگ آکر انھیں پولیس والوں کے ہاتھ سے چھڑا لے جاتے۔"

ماں: "بیٹا تم سُن چکے ہو، وہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ لوگ پولیس یا سرکار کے مقابلے میں ہنسا یا زبردستی سے کام لیں اور پھر ایسی بات پوچھتے ہو۔"

ہری: "ہاں ماتا جی میں بھول گیا تھا۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟"





۱۳

ماں: "آٹھ مہینے تک باپو جیل میں رہے سب جیل سے چھوٹے تو ہندوستان کا نقشہ بدل چکا تھا۔ گاندھی جی کا ملک پر اتنا اثر ہو چکا تھا کہ اپنی طاقت پر گھمنڈ کرنے والی انگریز سرکار کو اہنسا کے پجاری، گاندھی سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔

اُس سمجھوتے کے لئے ولایت میں ایک گول میز کانفرنس ہوئی۔ کانگریس نے اپنی طرف سے گاندھی جی کو اپنا نمائندہ بنا کر کانفرنس میں بھیجا۔ چلتے وقت مہاتما جی نے دیس والوں سے کہا: 'میں بچن دیتا ہوں کہ تم نے مجھ پر جو بھروسہ کیا ہے اس کو میں جھوٹا نہیں ہونے دوں گا۔'

"بارہ ستمبر کو گاندھی جی لندن پہنچے۔ وہاں اخباروں میں اُن کی بڑی بڑی تصویریں نکلیں۔ ایک اخبار نے ایک من گھڑت تصویر میں دکھایا مہاتما جی پرنس آف ویلز کے پاؤں چھو رہے ہیں۔ باپو اس تصویر کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے 'میں اپنے ملک کے غریب سے غریب بھنگی کے سامنے جھکنے کو تیار ہوں اور مجھے اُس اچھوت کے، جسے ہم نے صدیوں سے کچلا ہے پاؤں چھونے میں انکار نہیں پر انگلستان کے راج کمار کے تو کیا بادشاہ کے پاؤں بھی نہیں چھوؤں گا۔'

"باپو" نے گول میز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا: میں کسی طرح بھی ہندوستان میں انگریز کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا، ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ انگلستان ہندوستان کو اپنے برابر کا سمجھے اور جو سلوک اپنے برابر والوں سے کیا جاتا ہے وہ انگریز ہندوستانیوں سے کریں۔"

"کانفرنس جب ختم ہوئی تو بادشاہ اور ملکہ نے کانفرنس کے سب ممبروں کو محل میں ملنے کو بلایا۔ اور سب لوگ تو بڑھیا بڑھیا سوٹ پہن کر گئے پر باپو ایک معمولی سا کمبل اوڑھے، معمولی کھدّر کی دھوتی باندھے، چپل پاؤں میں پہنے انگلستان کے بادشاہ کے شاندار محل میں پہنچے۔"



ہری: "ماں! انھوں نے بادشاہ کے محل میں جاتے وقت بھی اچھے کپڑے نہیں پہنے؟"

ماں: "بات یہ ہے کہ ہمارے غریب دیس کے نمائندے کو غریبوں کے سے کپڑے ہی سجتے تھے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو بادشاہ اور ملکہ دیر تک مہاتما جی سے باتیں کرتے رہے۔"

ہری: "سچ مچ اماں!"

ماں: "انگلستان میں باپو ایک غریب انگریز عورت، مس لسٹر کے ہاں مہمان تھے،

وہاں وہ اسی ڈھنگ سے رہے جس ڈھنگ سے ہندوستان میں رہتے تھے۔ صبح شام، پرارتھنا کرتے اور روز پیدل گھومنے جاتے۔ اُن کی سادگی اور محبت کا اثر انگلستان کے غریب لوگوں کے دلوں پر بہت پڑا اور ابھی تک باقی ہے۔

"جب کوئی آدمی کسی نئے شہر یا ملک میں جاتا ہے، تو وہاں کے نامی آدمیوں سے ملنے، اُن کے گھر ضرور جاتا ہے۔ اِسی رواج کے مطابق باپو مسٹر چرچل سے ملنا چاہتے تھے۔ پر مسٹر چرچل نے ہمارے باپو سے، ملنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ 'میں اِس ننگے فقیر سے اُس وقت تک ملنے کو تیار نہیں جب تک وہ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر نہ آئے'۔

"باپو پر مسٹر چرچل کی اِس بدتمیزی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اُنھوں نے اِسے ہنس کر ٹال دیا، مگر ہندوستانیوں کا دِل مسٹر چرچل کے اِس جواب سے بہت دُکھا۔

"جب انگلستان اور ہندوستان میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو مہاتما جی اپنے ملک کو واپس لوٹے۔ راستے میں وہ اٹلی میں رُکے اور وہاں کے ڈکٹیٹر مسولینی سے ملے۔ پوپ کا محل ویٹکن دیکھا اور دسمبر کے آخر میں بمبئی پہنچے۔ اُس وقت ملک میں چاروں طرف پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ سرکار ہمارے بڑے بڑے نیتاؤں، جیسے پنڈت جواہر لال، خاں عبدالغفار خاں، سردار پٹیل کو پکڑ پکڑ جیلوں میں ٹھونس رہی تھی۔ کچھ نہیں تو نوّے ہزار آدمی اس وقت تک قید ہو چکے تھے۔ انگریزوں

کی یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی ڈھنگ سے کانگریس کو ختم کردیا جائے پر لوگوں پر اس کا الٹا ہی اثر ہوا۔ وہ سوراج کی دھن میں اور پکّے ہوتے گئے۔ دھیرے دھیرے سرکار کی طرف سے سختیاں بڑھتی گئیں اور مہاتما جی کو بھی پھر سے پکڑ کر جیل میں بھیج دیا۔ سرکار کا خیال تھا کہ باپو کو قید میں ڈال کر وہ سارے ہندوستان کی ہمّت توڑ سکتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا، کہ باپو کا روشن کیا ہوا دِیا ایسی آسانی سے بجھ جاتا۔

"باپو کے جیل چلے جانے کے بعد ملک کی مصیبتیں بڑھتی ہی گئیں، باپو قید میں دیس کی بپتا کا حال سُن سُن کر گھلے جاتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر اُنھوں نے سرکار کی سختیوں کو روکنے کے لئے مرن برت رکھا تو سرکار نے اُنھیں چھوڑ دیا۔ اُنھوں نے باہر آتے ہی ستیا گرہ روک دیا اور اچھوت اُدھار کے کام میں لگ گئے۔"

ہری: "اماں! اچھوتوں کو ہریجن کیوں کہتے ہیں؟"

ماں: "بیٹا لوگ جنھیں اچھوت سمجھتے ہیں اصل میں وہی تو ہری یعنی بھگوان کے بندوں کی سب سے زیادہ سیوا کرتے ہیں۔ اسی لئے وہی بھگوان کو سب سے بڑھ کر پیارے ہونے چاہئیں۔ یہ سمجھ کر ہی باپو نے اُنھیں ہری جن یا بھگوان کے پیارے کہنا شروع کردیا۔ یوں ان کا نام ہری جن پڑ گیا۔





۱۴

"تم سُن چکے ہو کہ باپو بچپن ہی سے چھوت چھات کو بُرا سمجھتے تھے۔ وہ دیس میں اس بُرے رِواج کو دیکھتے اور دل ہی دل میں کڑھتے۔ اِن کا کہنا تھا کہ سب آدمی برابر ہیں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کسی دوسرے سے اونچا سمجھے۔ بھگوان کی نظر میں ہر آدمی اپنے کاموں کی وجہ سے اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔ ذات پات سب من گھڑت ڈھکوسلے ہیں۔

"جو بات وہ اپنے دیس والوں کو بتانا چاہتے تھے اُسے وہ کہتے ہی نہیں تھے، کر کے بھی دکھایا کرتے تھے۔ اُنھوں نے وردھا میں ایک آشرم کھولا، جو سیواگرام آشرم کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہاں ہر ذات اور مذہب کے آدمی آ کر رہ سکتے تھے۔ آشرم میں رہنے کے لئے کچھ شرطیں تھیں جو ہر آشرم والے کو پوری کرنا پڑتی تھیں۔ ہر ایک کو اپنا سب کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا تھا جیسے چکّی پیسنا، کپڑے دھونا، کھانا پکانا، جھاڑو دینا، پاخانہ صاف کرنا وغیرہ۔ گاندھی جی اور کستوربا بھی سب آشرم والوں کی طرح یہ کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ سب آشرم والوں کے لئے ایک ہی جگہ کھانا پکتا اور سب ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے

تھے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے سب بھگوان کو یاد کرتے اور شانتی، شانتی، شانتی کہہ کر کھانا شروع کر دیتے۔

"باپو کی عادت تھی کہ جب تک آشرم کا کونا کونا نہ دیکھ لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ اگر کہیں ذرا سا بھی کوڑا کرکٹ دیکھتے جھٹ اپنے آپ اُسے صاف کرنے لگتے آشرم میں اگر کوئی بیمار ہوتا تو گاندھی جی اسے ضرور جا کر دیکھتے، اُسے ہنسا کر اُس کا دِل بہلاتے۔ بیماروں کی سیوا اور علاج کرنا بھی خوب جانتے تھے۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آشرم میں ایک مدراسی لڑکے کو پیچش ہو گئی۔ جب وہ کچھ اچھا ہوا تو لیٹے لیٹے ایک دن وہ دکھن کی مزے دار کافی کو یاد کر رہا تھا۔ یوں تو اس نے اور سب آشرم والوں کی طرح معمولی اُبلا ہوا کھانا کھانا سیکھ لیا تھا۔ پر کافی اسے سدا یاد آتی تھی۔ کافی، چائے اور پان کی آشرم میں بندش تھی، تو پھر یہ مدراسی لڑکا کافی کیسے پی سکتا تھا! وہ ابھی کافی کے دھیان ہی میں تھا کہ اسے مہاتما جی کی کھڑاؤں کی کھٹ پٹ سُنائی دی، اور تھوڑی دیر میں باپو کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ باپو اس کے پلنگ کے پاس آکر بولے 'آج تو تم پہلے سے بہت اچھے معلوم ہوتے ہو۔ اب تو تمھیں بھوک بھی لگتی ہوگی، کہو کیا کھاؤ گے، دوسے کھانے کو تو جی نہیں چاہتا۔"

ہری: "اماں! دوسے کیا ہوتے ہیں؟"

ماں: "یہ ایک قسم کے نمکین چیلے ہوتے ہیں جو صرف دکھن میں بنتے ہیں۔ باپو کے منہ

سے کھانے کی بات سُن کر لڑکے کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ وہ ہچکچا کر بولا: 'کیا میں کافی پی سکتا ہوں؟' 'ارے پرانے پاپی'، باپو پیار سے ہنس کر بولے 'اُچھا یہ بات ہے، تو بھئی تمھیں کافی ضرور ملے گی، اور ہلکی کافی تمھیں فائدہ بھی دے گی، پر کافی کے ساتھ کھاؤ گے کیا؟ دوسے تو بن نہیں سکتے، ہاں گرم توس اور کافی کا بھی جوڑ اچھا ہے، میں ابھی بھجواتا ہوں'۔

"یہ کہہ کر باپو وہاں سے چلے گئے۔ لڑکا حیران تھا کہ آشرم میں تو چائے کافی کی اجازت نہیں۔ باپو کہیں بھولے سے تو نہیں کہہ گئے۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ اُس کی اتنی اچھی قسمت ہے کہ آشرم میں اُسے کافی پینے کو ملے! اور وہ بھی باپو کے ہاتھ سے۔

"تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اُس نے پھر کھڑاؤں کی کھٹ پٹ سُنی۔ بچارے کا دل دھک کرنے لگا۔ وہ سمجھا باپو یہ کہنے آرہے ہیں کہ وہ کافی کے لئے بھولے سے کہہ گئے تھے، آشرم میں کافی نہیں مل سکتی۔ پر جب اُس نے دیکھا کہ گاندھی جی ہاتھ میں کھدر کے رومال سے ڈھکی ہوئی ایک تھال لئے چلے آرہے ہیں تو اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ لڑکے کو تھال دیتے ہوئے باپو بولے 'یہ لو اپنی کافی اور توس، دیکھنا میں اپنے ہاتھ سے بنا



گرلایا ہوں اور تم سادگھنی بھی مان جائے گا کہ میں نے کیسی اچھی کافی بنائی ہے۔"

"پر۔۔۔۔پر" لڑکا ہکلا ہکلا کر بولا "آپ نے کسی اور سے کیوں نہ کہہ دیا۔ میرے کارن آپ کو تکلیف ہوئی۔"

"بس بس!" گاندھی جی پریم سے بولے "کیوں بے کار کافی کا مزا خراب کرتے ہو۔ با سو رہی تھیں میں نے انھیں جگانا ٹھیک نہ سمجھا۔ لو اب تم کافی پیو میں جاتا ہوں کوئی آکر برتن لے جائے گا" یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلے آئے۔ کافی بہت اچھی اور ہلکی بنی ہوئی تھی۔ لڑکے نے خوب مزے لے کر پی۔ کافی کیا تھی باپو کے ہاتھ کا دیا امرت تھا۔"

ہری: "اماں! جب آشرم میں کافی اور چائے کوئی پیتا ہی نہ تھا، تو پھر اتنی جلدی کافی آ کہاں سے گئی؟"

ماں: "بات یہ تھی کہ راجا گوپالاچاری اور مسٹر اینڈ روز، گاندھی جی کے پاس آتے رہتے تھے اور اُن کے لئے کستوربا کے پاس یہ چیزیں رکھی رہتی تھیں۔

"باپو کے پاس سیواگرام میں طرح طرح کے لوگ آتے تھے کوئی اپنے بیمار بچے کو علاج کے لئے لاتا، کبھی میاں بیوی باپو سے اپنا جھگڑا چکانے آتے کوئی اُن سے زمین کا جھگڑا فیصل کرانے آتا۔ ایک بار ایک صاحب آئے جو کچھ پاگل سے لگتے تھے معلوم ہوا کہ بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ پھر کئی بار جیل کی ہوا کھائی اور آخر میں جوگی ہو گئے۔ اُنھوں نے اٹھاروں برت رکھے۔ پھر

ایک دِن دُنیا کا سب دھندا چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ برسوں ننگے پھرا کیے۔ کئی برس چُپ سادھے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے ہونٹ تار سے سِی لیے اور کچا آٹا اور نیم کے پتے کھا کر پیٹ بھرا کرتے تھے۔

" پھرتے پھراتے سیواگرام آشرم آنکلے اور مہاتما جی سے ملے۔ باپو نے بڑے پریم سے اُن سادھوجی کی دیکھ بھال کی اور اُنھیں آدمیوں کی دنیا میں کھینچ لائے۔

" پہلے پہلے تو وہ کام کرنے سے گھبرایا کرتے تھے۔ پھر دن بھر میں وہ دھیرے دھیرے لگاتار سترّہ گھنٹے کام کرنے لگے۔ آٹھ دس گھنٹے چرخہ کاتتے اور سات آٹھ گھنٹے آشرم میں لوگوں کو پڑھاتے تھے۔ جو آدمی کبھی منہ سِی کر پھرا کرتا تھا اب اُس کے ٹھٹھوں سے آشرم گونج اٹھا۔ اب تو وہ ایک چھوٹی سی دھوتی بھی لپیٹ لیتے تھے۔ پر اِس کے سوا کوئی اور سامان اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ جہاں سانپ بچھو رینگ رہے ہوں وہاں وہ بے دھڑک چلے جاتے تھے۔ ہاں! کبھی کبھی جب اُنھیں للک اٹھتی تو گھبرائے ہوئے مہاتما جی کے پاس آکر اُن سے کنوئیں میں اُلٹا لٹکنے کی اجازت چاہتے۔ پر ایشور کا شکر ہے باپو کا کہا ہوا اُن کے لئے پتھّر کی لکیر بن گیا تھا۔ اس لئے وہ کبھی اپنی من مانی نہ کر پاتے تھے۔

" اُن دنوں باپو آشرم میں بیٹھے ملک سے چھوت چھات، ذات پات، اور جہالت کو دُور کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے چرخہ سنگھ، تعلیمی سنگھ اور

گئو سیوا سنگھ بنائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کا ہر گاؤں والا اپنے خالی وقت میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھا رہے۔ کھیتی کے کام کے علاوہ کچھ اور بھی کما سکے۔ چرخہ کاتے، نواڑ بُنے یا کوئی اور ہاتھ کا کام سیکھے اور ساتھ ساتھ پڑھنا لکھنا بھی سیکھے۔ یہی سب چیزیں تھیں جن کا پرچار کر کے باپو عام گاؤں والوں کو آزادی کے لئے تیار کر رہے تھے۔ صرف انگریز کی غلامی سے آزادی نہیں، بلکہ غریبی سے آزادی، بیماری سے آزادی، اور جہالت سے آزادی بھی دلانا چاہتے تھے۔ کیونکہ اُن سب چیزوں کا آپس میں سمبندھ ہے۔ اس لئے اُن میں سے کوئی ایک نہ ہو تو سب بیکار ہیں۔ کیوں ہری! کیا تمھیں نیند آ رہی ہے، تم تھک تو نہیں گئے۔ بس اب تھوڑی سی کہانی اور رہ گئی ہے کہو تو پوری کر دوں نہیں تو پھر کل سُن لینا۔"

ہری: "نہیں اماں! مجھے نیند نہیں آ رہی، میں بڑے دھیان سے سُن رہا ہوں، بِنا ساری کہانی سُنے جی نہیں مانے گا، آپ سُنائے جائیے۔"





۱۵

ماں: "ہندوستان والوں کے دلوں پر گاندھی جی کا اثر انگریز سرکار کے اثر سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ کچھ صوبوں میں ان کے ہی ساتھی کانگریسیوں نے حکومت کی کرسیاں سنبھال رکھی تھیں۔ انگریز کو دیس کی بدلتی ہوئی حالت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جنتا کا بڑھتا ہوا جوش انھیں کچھ بے بس سا کئے دے رہا تھا۔

"ہمارے نیتاؤں کو حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لئے، تھوڑے ہی دن بیتے تھے کہ انگلستان اور جرمنی میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ دنیا کی دوسری بڑی لڑائی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں نے ہمارے نیتاؤں سے پوچھے گچھے بنا ہی ہمارے دیس کا مال اور سپاہی لڑائی میں جرمنی کے خلاف بھیجنا شروع کر دئے۔ لوگوں کو اس بات سے بہت دکھ ہوا۔ کانگریسی نیتاؤں نے فوراً گاندھی جی کے کہنے پر حکومت کی کرسیاں چھوڑ دیں۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ جب اتنے بڑے معاملے میں ہمارے نیتاؤں کی پرواہ نہ کی گئی تو ان کا کرسیوں پر رہنا بے کار ہے۔

"باپو کو آشرم میں بیٹھے بیٹھے دنیا بھر کی سب خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ ملکوں ملکوں میں لڑائی ہونے سے کیا کیا بربادی ہوتی ہے۔ انھوں نے

جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر کو ایک چٹّھی لکھی۔ اِس چٹّھی میں اُنھوں نے لکھا کہ: "یوں تو میں دنیا میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا پر ایک طرح تم اور میں آج کل ایک ہی دشمن یعنی انگریز سے لڑ رہے ہیں۔ کیا ہی اچھّا ہو، کہ تم بھی میری طرح اہنسا کے ہتھیار سے انگریز سے لڑو، کیونکہ ہنسا کی لڑائی میں دنیا کی بربادی ہے۔ اگر اہنسا کے ہتھیار کی بابت تم کچھ جاننا چاہو، تو تمھاری فوج میں ایک معمولی سپاہی ہے جو میرے آشرم میں رہ چکا ہے، تم اُس سے معلوم کر سکتے ہو۔ اِس وقت ایک تم ہی ہنسا کی لڑائی روک سکتے ہو۔۔۔۔۔۔" یہ خط گاندھی جی نے وائسرائے کی معرفت بھیجنا چاہا پر وائسرائے نے اِس کی اجازت نہ دی۔ اگر وائسرائے نے اس خط کو جانے دیا ہوتا اور ہٹلر مہاتما جی کی بات مان لیتا تو دنیا اِس طرح تباہ نہ ہوتی پر وہاں تو انگریزوں کو اور ہٹلر کو اپنی اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔

"اِنھیں دِنوں مہاتما جی نے کئی بار کوشش کی کہ انگریز ہمیں شانتی سے آزادی دے دیں، پر ہر بار وہ ناکام رہے۔ مہاتما جی لڑ کر اور لہو بہا کر آزادی لینے کو تیّار نہ تھے۔ اگر وہ چاہتے تو سارے دیس کو سرکار سے لڑنے کے لئے میدان میں لا کر کھڑا کر سکتے تھے۔ پر اہنسا کے پجاری کو یہ بات منظور نہ تھی۔ اُنھوں نے سرکار سے لڑائی جاری رکھنے کا ایک نیا ڈھنگ نکالا اور بہت سے لوگوں کا مل کر ستیّاگرہ کرنا، بند کر کے ایک ایک کو ستیّاگرہ کے لئے بھیجا۔ یہ ایسے لوگ تھے جو اہنسا کے اصولوں کو اچھّی طرح سمجھتے تھے اور اُن پر عمل کرتے تھے۔ سب

سے پہلے باپو نے شری ونوبا بھاوے کو چُنا۔ جب وہ پکڑے گئے تو سرکار نے سینکڑوں دیش بھگتوں کو بیٹھے بٹھائے پکڑ لیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی چار سال کے لئے جیل بھیج دیا، پر تھوڑے ہی دن میں ہندوستانیوں کے جوش اور بے چینی سے گھبرا کر انگریز سرکار نے ہمارے سب لوگوں کو چھوڑ دیا۔

"یورپ کی لڑائی ابھی زوروں پر تھی، جو خبر آئی کہ جاپان نے امریکہ پر ہلّہ بول دیا اور ہندوستان کی طرف بڑھ کر رنگون پر قبضہ کر لیا۔ رنگون پر جاپانی جھنڈے کا لہرانا تھا کہ ہم کو دشمن دروازے پر دکھائی دینے لگا۔ سارے ملک میں بے چینی پھیل گئی اور لوگ طرح طرح سے سوچنے لگے۔ کوئی کہتا تھا کہ امریکہ اور جاپان کی لڑائی میں ہم گھن کی طرح پس جائیں گے۔ کوئی چاہتا تھا کہ جاپانی برما سے بڑھ کر ہندوستان سے انگریزوں کو نکال دیں۔ غرض لوگ آزاد ہونے کے لئے ایک بار پھر رسیاں تڑانے لگے۔

"جب انگریزوں نے ملک میں اتنی زیادہ بے چینی دیکھی تو انھوں نے لندن سے مسٹر کرپس کو بھیجا کہ وہ دلّی آ کر ہندوستان اور انگلستان میں سمجھوتہ کرائیں۔ اندھیرے میں آشا کی ہلکی سی کرن دکھائی دی۔ لوگ سمجھے اب شاید آزادی مل جائے پر ایسا نہ ہوا۔ جو شرطیں کرپس لائے تھے وہ ہمارے نیتاؤں کو پسند نہ آئیں اور جو ہمارے نیتا چاہتے تھے وہ انگریز دینے کو تیار نہ تھے۔ آخر

کرپس جیسے آئے تھے ویسے ہی لوٹ گئے۔ گاندھی جی اور دوسرے نیتاؤں نے طے کیا کہ جب تک ملک آزاد نہ ہو گا یورپ کی لڑائی میں انگریز کو مدد نہیں دیں گے۔

"باپو نے جب دیکھا کہ یورُپ کی لڑائی کی آگ اور جاپان کی جنگ کی لپٹیں ہمیں بھسم کئے ڈالتی ہیں اور بے بس ہندوستانیوں کی مرضی کے خِلاف اُن کی دھن دولت اور جوان اولاد لڑائی میں کام آرہی ہے، تو اُن کو بڑا دکھ ہوا۔ اُنھوں نے سب نیتاؤں کو اکٹھا کیا اور اُن سے کہا کہ جب تک ہم انگریزوں کے بس میں ہیں، انگریز اسی طرح ہمارا لہو چوستے رہیں گے۔ آؤ ہم مِل کر انگریز کو اپنے ملک سے باہر نِکال دیں پر ہم نے انگریزوں سے ہنسا کی لڑائی لڑ کر اُسے نِکالا، تو کیا نِکالا۔ ہم کو تو ایک دِل اور ایک زبان ہو کر بس اِتنا کہنا چاہئے کہ 'ہند چھوڑ دو' 'ہند چھوڑ دو'۔ گاندھی جی کے مُنہ سے اِتنی بات کا نکلنا تھا کہ چالیس کروڑ زبانوں سے انگریزو! ہند چھوڑ دو' کی پُکار سارے دیس میں گونج اُٹھی۔ انگریزوں کو اپنے گھروں کے باہر، سڑکوں پر، دفتروں کی میز پر، موٹر پر، غرض کہ ہر جگہ 'ہند چھوڑ دو' لکھا ہوا دِکھائی دینے لگا اور وہ سمجھ گئے کہ اب سچ مُچ ہندوستان چھوڑنے کا وقت آگیا ہے۔

"مہاتما جی نے ساتھ ہی ساتھ وایسرائے کو ایک چِٹھی لکھی کہ اگر انگریز ہندوستان کو آزاد کر دیں تو ہندوستانی لڑائی میں انگریزوں کی مدد کریں گے۔ اگر انگریز اِس وقت بھی اُنھیں آزادی نہیں دیں گے تو پھر ہندوستانی اپنی جان پر

کھیل کر آزادی سے لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ ٹکر بڑی سخت ہوگی، پر ہوگی اہنسا کے اصول پر۔"

ہری: "اماں! وائسرائے نے باپو کے خط کا کیا جواب دیا؟"

ماں: "مہاتما جی کو اِس خط کا جواب تو وائسرائے کیا دیتے۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہمارے سب بڑے بڑے نیتاؤں اور کام کرنے والوں کو پھر جیلوں میں بند کر دیا۔

"باپو اور کستور با کو لے جا کر پونا میں آغا خاں کے محل میں نظر بند کر دیا۔ وہیں گاندھی جی کے کچھ ساتھی جیسے سروجنی نائیڈو، سوشیلا نیر اور مہادیو ڈیسائی بھی رکھے گئے۔"



۱۶

ہری: "محل میں تو باپو بڑے آرام سے رہتے ہوں گے؟"

ماں: "نہیں بیٹا! وہ دکھیوں کا سہارا، غریبوں کے دِل کا اُجالا، ہندوستان کی نیّا کا بوڑھا کھیون ہارا، ہمارا غریب اور دکھیارا باپ ہم سب سے الگ رہ کر بھلا کیا آرام پاتا؟ اس شان دار محل میں اُنھیں کیا سُکون مِل سکتا تھا، وہاں کی اونچی اونچی دیواریں اُنہیں کھانے کو دوڑتی تھیں۔ غریبوں سے الگ رہ کر دنیا کی کوئی چیز باپو کو اچھی نہ لگتی تھی۔

"وہ اِس محل میں بھی معمولی طرح رہتے تھے۔ صبح سویرے اُٹھتے، پرارتھنا کرتے پھر تھوڑا پھلوں کا رس پیتے اور کام میں لگ جاتے۔ سب ساتھی ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے "بلبل ہند" سروجنی نائیڈو طرح طرح کے چٹکلوں سے باپو کا دل بہلاتیں شام کو پھر پرارتھنا ہوتی، جس کے بعد دوبارا کام شروع ہو جاتا۔ سارا دن کام کرنے کے بعد رات کو سب جلدی ہی سو جاتے تھے۔

"ابھی مہاتما جی کو نظر بند ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اُن کے پیارے اور پرانے ساتھی مہادیو ڈیسائی دِل کی دھڑکن بند ہو جانے سے، ایکا ایکی پرلوک

سِدھار گئے۔ مہادیو بھائی اور گاندھی جی کا ساتھ، تئیس برس کا تھا۔ باپو انھیں اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ مہادیو بھائی نے بھی اپنا جیون باپو اور دیس کے لیئے تج دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ باپو اُن سے اپنے دل کی سب باتیں کیا کرتے۔ وہ سدا باپو کو سچّی اور کھری رائے دیتے تھے۔

" مہادیو بھائی کی میّت کو باپو نے اپنے ہاتھ سے نہلایا، ارتھی تیار کی اور باپ کی طرح سب رسمیں ادا کیں۔ محل میں باغ کے ایک کونے میں چِتا کو آگ دی گئی۔ اور وہیں اُن کی سمادھی بنی۔ جب تک باپو اس محل میں رہے روز اس سمادھی پر پھول چڑھانے جایا کرتے تھے۔

" گاندھی بابا کے نظر بند ہونے کے بعد جب ملک میں کوئی بڑا نیتا نہ رہا جو جنتا کو شانت رکھتا تو لوگ جوش میں آکر جس طرح جس کی سمجھ میں آیا سرکار سے لڑتے رہے کچھ جوشیلے لوگ گاندھی جی کا اہنسا کا سبق بھول گئے اور چُھپ چُھپ کر لوگوں کو انگریزوں سے ہنسا کی لڑائی لڑوا رہے تھے۔ سرکار نے بھی لوگوں کو دبانے کے لیئے گولیاں برسائیں، گاؤں کے گاؤں جلا کر راکھ کر دئیے۔ ہزاروں عورتیں، مرد اور بچّے مارے گئے، ہزاروں جیلوں میں ٹھونس دئیے گئے اور اس دیس کی بے سردار فوج راستے سے بھٹک گئی۔

" باپو کو گمان بھی نہ تھا کہ آزادی کی لڑائی اِن کے جاتے ہی اتنی خونی صورت اِختیار کرے گی۔ جوشیلے لوگ ان کی للکار کے غلط معنی سمجھ کر اپنے آپ کو اِس

طرح جوکھوں میں ڈال دیں گے۔

"جیل میں باپوٗ کو پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ تن تو ان کا بے شک جیل میں تھا پر من ہمارے ساتھ تھا۔ اور کیسے نہ ہوتا آخر وہ ہم سب کے باپ تھے۔ اپنے بچّوں کو ٹھیک راستے سے بھٹکتا ہوا دیکھ کر اُن کا دل خون ہو رہا تھا۔

"سرکار نے مار پیٹ اور ہنسا کا سارا الزام، زبردستی باپوٗ کے کندھوں پر ڈال دیا۔ گاندھی جی نے بہت چاہا کہ سرکار کچھ نیتاؤں کو چھوڑ دے کہ وہ لوگوں کو سمجھا بجھا کر مار دھاڑ سے روکیں اور اہنسا کے اصول انھیں یاد دلائیں پر سرکار اس بات پر کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ جب باپوٗ نے دیکھا کہ سرکار ان کی بات سُننے کو کسی طرح تیار نہیں تو لاچار ہو کر انھوں نے ۱۰ فروری ۱۹۴۳ء کو اکیس۲۱ دن کا برت شروع کیا۔ جس سے وہ دنیا کو اپنے بے گناہ ہونے کا یقین دلائیں۔

"برت کے اکیس۲۱ دن کے لئے سرکار باپوٗ کو چھوڑ دینا چاہتی تھی، پر باپوٗ نے اس بات کو منظور نہ کیا۔ کستوربا ہر وقت گاندھی جی کی سیوا میں لگی رہتیں گاندھی جی دن پہ دن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ سارے دیس پر ایک ایک دن بھاری تھا۔ سب کی آنکھیں اور کان آغا خاں محل کی طرف لگے ہوئے تھے۔ لوگ ہڑتالیں کر رہے تھے، دعائیں مانگ رہے تھے۔ دہلی میں سرکار کے تین ہندوستانی وزیر حکومت سے الگ ہو گئے، پر سرکار ٹس سے مس نہ ہوئی خدا خدا کر کے اکیس۲۱ دن پورے ہوئے اور تین مارچ کو گاندھی بابا نے اپنا برت

کھولا اور کستوربا کے ہاتھ سے سنترے کا رس پیا، میرا بہن نے عیسائی دھرم کے بھجن گائے، مسلمانوں نے قرآن پڑھا۔ پارسیوں، ہندوؤں اور بودھوں نے اپنے اپنے دھرم کی کتابیں پڑھ کر باپو کو سُنائیں۔

"جب باپو نے اپنا برت کھولا تو ہندوستانیوں کی جان میں جان آئی۔ اِس برت سے سارا ملک ایک آواز ہو کر 'مہاتما گاندھی کی جے' اور 'انقلاب زندہ باد' پکار اٹھا۔

"باپو کی تقدیر میں ابھی اور دُکھ لکھے تھے۔ اُن کے پیارے ساتھی مہادیو ڈیسائی کے مرنے کا غم ابھی ہرا ہی تھا کہ کستوربا بہت بیمار ہو گئیں۔ سب نے بہت کوشش کی کہ وہ قید میں نہ رہیں بلکہ اپنے گھر واپس چلی جائیں پر واہ ری ہمّت انھوں نے گاندھی جی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ شاید اُن کے دل کو خبر ہو گئی تھی کہ اُن کا وقت آن پہنچا ہے، اِس لئے وہ اپنے پتی کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتیں کستوربا کی طبیعت بگڑتی ہی چلی گئی اور وہ اٹل گھڑی آن پہنچی جب گاندھی جی اور کستوربا کا ساٹھ سال کا ساتھ چھوٹ گیا اور با خدا کو پیاری ہو گئیں۔"

ہری: "اماں! گاندھی جی با کے مرنے پر بہت روئے ہوں گے۔"

ماں: "بیٹا! ایسی بے بسی میں اگر یہ مصیبت کسی اور پر پڑتی تو نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا پر گاندھی جی اس وقت بھی بھگوان کی طرف دھیان لگائے رہے اور برابر اپنے دیس والوں کے لئے دعائیں مانگتے رہے۔"

"مہادیو دیسائی کی سمادھی کے پاس ہی گاندھی جی نے با کی سمادھی بنادی جب تک گاندھی جی آغا خاں محل میں نظر بند رہے روز دونوں سمادھیوں پر پھول چڑھاتے اور دعا مانگنے جایا کرتے تھے۔ اب بھی ہر اتوار کو، پونا کے اور باہر کے بھی بہت سے لوگ آغا خاں محل میں یاترا کو جاتے ہیں۔

"باپو کی اکیلی جان اور چاروں طرف دکھوں کا گھیرا، آخر بے چارے کب تک سہتے کمزور ہوتے ہوتے بہت بیمار ہو گئے۔ سرکار نے اُن کو جب زیادہ بیمار دیکھا تو اپنی سلامتی اسی میں سمجھی کہ گاندھی جی کو چھوڑ دے۔ چھ مئی کو اس نے گاندھی جی کو بلا کسی شرط کے چھوڑ دیا اور اُن کے ساتھ ہی اُن کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ آغا خاں محل چھوڑنے سے پہلے جب آخر بار، باپو سمادھیوں پر پھول چڑھانے گئے تو کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا نہ بہ رہی ہو۔"

ہری: "ماتا جی! یہ تو مجھے بھی یاد ہے کہ جب باپو کے چھوٹنے کی خبر آئی تو ہمارے گھر میں بڑی خوشی منائی گئی تھی۔"

ماں: "ہاں بیٹیا! ایک ہمارے ہی گھر میں کیا سارے دیس میں گھر گھر خوشی کے چراغ جلائے گئے۔"





۱۷

ماں، "باپو کے جیل سے نکلتے ہی ہندوستانیوں کے اندھیرے اور اُداس دِلوں میں پھر اجالا ہو گیا۔ سب کو ایسا معلوم ہوا کہ اُن کے دکھ کا بٹانے والا آگیا۔

"کچھ دن تک تو گاندھی جی پونا اور جوہو میں رہے کہ اُن کے کمزور جسم میں کچھ جان آجائے۔ پھر جب اُن میں طاقت آگئی تو وہ پوری ہمت سے کمر باندھ کر آزادی کی جنگ کے سپہ سالار بن کر کھڑے ہو گئے۔ اُنھوں نے لوگوں کو اُن کی بھول چوک دِکھا دِکھا کر سمجھایا اور سرکار کو بھی اس کی غلطیاں بتائیں۔ اُنھوں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ انگریز ہندوستان کا راج ہندوستانیوں کو سونپ دیں، پر انگریز ہندوستان چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ وہ بار بار یہی شرط لگاتے کہ ہندو اور مسلمان سب مل کر آزاد ہندوستان کی حکومت سنبھالیں تو ہم آزادی دینے کو تیار ہیں۔ مہاتما جی یہ کہتے کہ مسلمان اور ہندو ایک ہی دیس کے باسی ہیں یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ آزاد ہونے کے بعد ہم آپس میں طے کرلیں گے کہ اس ملک میں ہم کیسے رہیں۔ انگریز کو ہمارے گھریلو معاملوں میں دخل نہیں دینا چاہیئے، پر اس وقت تو وہی قصّہ تھا جو تم نے سُنا ہوگا ایک بار دو بلیوں میں ایک

ڈبل روٹی پر لڑائی ہوئی تو انھوں نے ایک بندر کو انصاف کرنے کے لئے بلایا کہ وہ روٹی کے ٹکڑے برابر برابر تول کر بانٹ دے۔ بندر تھا بڑا چالاک جو ٹکڑا بھاری نکلتا اُس میں سے بڑا سا نوالا کھا لیتا تو وہ بہت ہلکا ہو جاتا، پھر وہ برابر کرنے کے لئے دوسرے ٹکڑے پر لپکتا اور اس میں سے بھی اتنا بڑا اُڑا جاتا کہ اب وہ پلڑا ہلکا ہو جاتا، غرض اسی بہانے وہ ساری روٹی کھا کر چلتا بنا اور مور کھ بلیاں ایک دوسرے کا منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

"اسی طرح جب ہندو اور مسلمان آپس میں لڑتے لڑتے مرے جا رہے تھے تو حکومت کے چودھریوں نے کہا: 'آؤ ہم تمھارے ملک کو دو حصّوں میں بانٹ دیں۔ ایک ہندوستان اور دوسرا پاکستان'؛ ہمارے نیتا تیار ہو گئے کہ کسی بھاؤ سہی آزادی تو ملے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہ بٹوارہ ہی نفرت اور پھوٹ کے بیج بو دے گا۔

"دیس کے ہر کونے سے بڑی دل ہلا دینے والی خبریں آنے لگیں۔ پنجاب میں کچھ گڑبڑ سی ہو ہی رہی تھی کہ کلکتے سے خبر آئی کہ وہاں مسلمان اور ہندو آپس میں لڑ پڑے۔ بھائی بھائی کا دشمن بن بیٹھا ہے۔ گاندھی جی بے چین ہو گئے اور کلکتے پہنچے۔ جو سُنا تھا وہ بالکل سچ نکلا۔ ہندو اور مسلمان جو سینکڑوں سال سے ایک جگہ رہتے اور ایک ساتھ اُٹھتے بیٹھتے آئے تھے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ باپو نے پہنچتے ہی کلکتے کے میدان میں ایک جلسہ

کیا۔ کہاں تو مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کی صورت دیکھنا نہ چاہتے تھے اور کہاں سب لاکھوں کی گنتی میں باپوؔ کی بات سننے جمع ہو گئے۔ باپو نے اُن سب کو پریم کا سندیسہ سُنایا اور تھوڑی ہی دیر کے اندر نفرت کی کالک دلوں سے دھل گئی۔ باپو نے اب چاہا کہ ہندو اور مسلمانوں نے جو ہتھیار جمع کر رکھے ہیں وہ لاکر باپو کو دے دیں۔ جب لوگوں نے ایسا نہ کیا تو باپوؔ کو خیال ہوا کہ ابھی ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ دل کا کندن ابھی دمکا نہیں۔ اس کے لئے انھوں نے برت رکھا۔ جب بنگال کے لوگوں نے باپو کے برت کی خبر سنی تو سینکڑوں نوجوانوں نے ہزاروں کی گنتی میں ہتھیار لالا کر باپوؔ کے قدموں میں ڈال دئے اور قسمیں کھائیں کہ اب ہم آپس میں کبھی نہیں لڑیں گے اور سچ مچ جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔

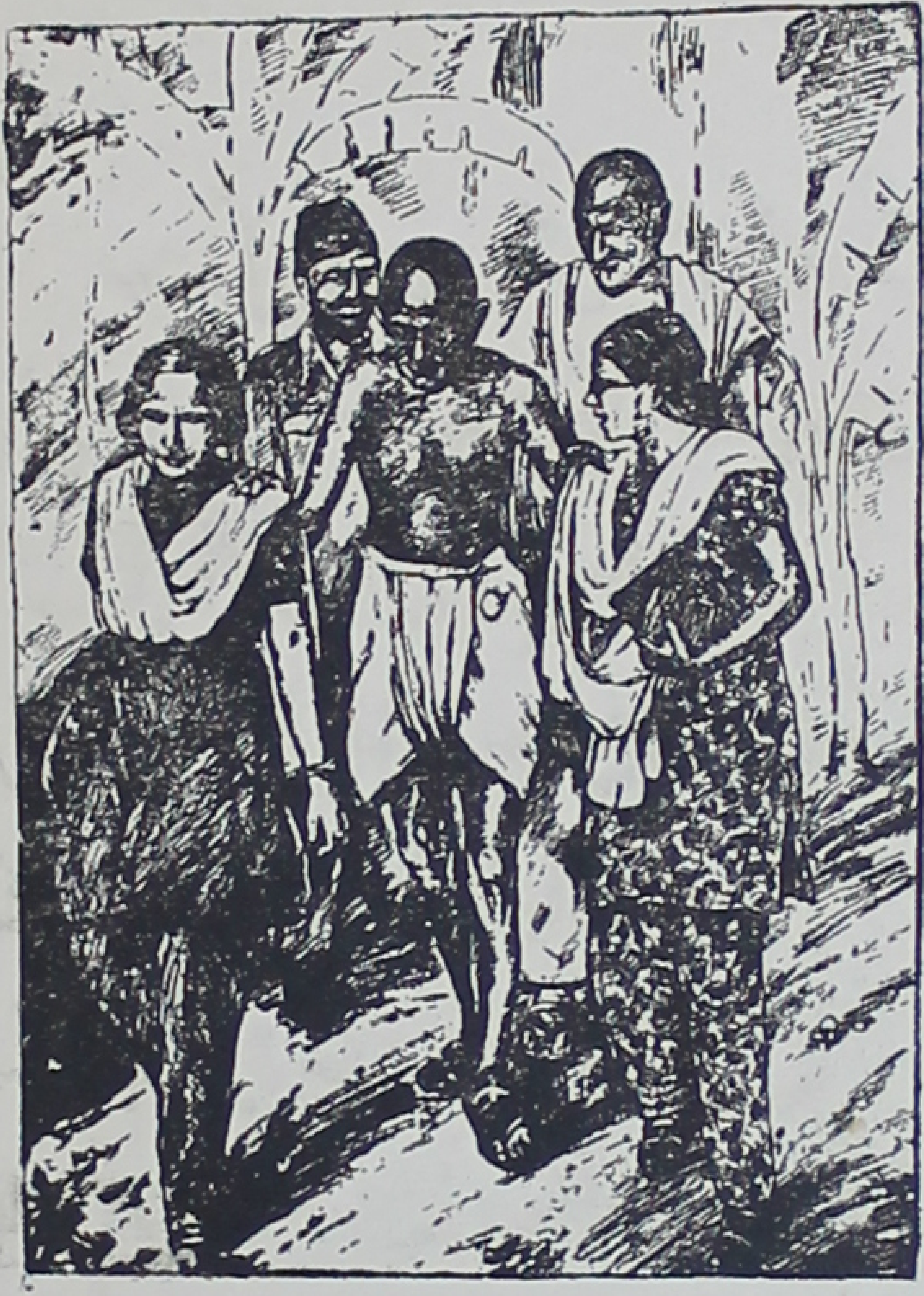
"نفرت کی چنگاریاں ابھی بالکل بجھی نہ تھیں۔ باپو ملک کے ایک حصّے میں شانتی کراتے تو کسی دوسری جگہ آگ بھڑک اٹھتی۔ انھیں دنوں پوربی بنگال میں نوآکھالی سے خبر آئی کہ مسلمان ہندوؤں کے گھر لوٹ رہے ہیں اور اُن کو مار رہے ہیں۔ یہ سُنتے ہی دبلا پتلا بوڑھا باپوؔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر چلا اور نوآکھالی کے



ایک ایک گاؤں میں پریم کا سندیسہ لے کر پہنچا۔ وہ اکثر پیدل دورہ کرتے اور کہیں کہیں تو ننگے پاؤں جاتے تھے۔



نواکھالی میں گاؤں والوں کے یہاں کھانا کھاتے، وہیں اُٹھتے بیٹھتے اور آرام کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو بُلا بُلا کر سمجھاتے۔ اُن سے چھینی ہوئی چیزیں اصلی مالک کو واپس دلواتے لوگوں کو نئے سرے سے اُن کے گھروں میں بساتے اور بچھڑے ہوؤں کو پھر ملواتے تھے۔



"نواکھالی کے بعد بہار کی باری آئی۔ خبر ملی کہ بہار میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں صاف کر دئے۔ بہار کی بپتا سُن کر باپو تڑپ گئے، اور بہار پہنچے۔ وہی اپنا پریم کا سندیسہ وہاں بھی دھرایا، کہ کسی کی جان لینا بڑا پاپ ہے۔ ہندو مسلمان، سب ہندوستانی

ہیں، ایک ہیں، سینکڑوں برسوں سے ساتھ رہتے آئے ہیں اور دونوں کو یہیں رہنا ہے۔ پھر لڑ جھگڑ کر پاپ کے گڑھے میں کیوں گریں۔

"پہلے پہلے تو اِن لوگوں نے گاندھی جی کی باتوں پر کان نہ دھرے، پر دھیرے دھیرے سچ کی دھیمی آواز کا اثر اُن پر ہونے لگا۔ وہ اس بھیانک خواب سے چونکے۔ اُن کو یاد آگیا کہ وہ بھیڑئے نہیں، انسان ہیں۔ اپنے کئے پر پچھتائے اور شانتی اور امن رکھنے کی قسم کھائی۔

"اِن جھگڑوں میں ہمارے باپو کو نہ آرام کا خیال تھا، نہ کھانے پینے کی سُدھ نہ کڑاکے کی سردی کی پروا، نہ لُو کے تھپیڑوں کی فکر، وہ کبھی نواکھالی میں ننگے پاؤں چلتے ہوئے نظر آتے تو کبھی بہاریوں کے گھائل دِلوں پر مرہم رکھتے ہوئے دِکھائی دیتے، ہِمّت تھی کہ ہار نہ مانتی تھی، اور ایمان تھا کہ کٹھن مصیبتیں جھیل جھیل کر اور نکھرتا جارہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھگوان اپنے اِس نیک بندے کا امتحان لے رہا ہے۔ مگر باپو شری کرشن کمار اور ہریش چندر کی طرح اِس امتحان میں پورے اُترے۔

"آخر وہ دِن آن پہنچا جب بھارت آزاد ہوا اور چاروں طرف خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، پر آزادی کے ساتھ ساتھ مار دھاڑ اور پاپ کے کالے بادل بھی چاروں طرف اُمنڈ آئے۔ جہالت، فرقہ پرستی اور پاپ کے گھُپ اندھیرے میں ہم راستے سے بھٹک گئے۔ پریم کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، بھائی بھائی

کا دشمن ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا کہ انسانوں نے بھیڑیوں کا روپ دھار لیا ہے۔ ہندو مسلمان کے خون کا پیاسا تھا اور مسلمان ہندو کی جان کا دشمن۔ اس بھیانک سمے میں صرف دو چار روشنیاں دکھائی دیتی تھیں جو اپنی پوری طاقت سے پاپ کے اندھیرے میں اُجالا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔"

ہری: "ماں! یہ کیسی روشنیاں تھیں؟"

ماں: "یہ تھے ہمارے باپو اور اُن کے ساتھی، پر ہم نے ان کی طرف سے آنکھیں پھیر رکھی تھیں۔ ہر طرف سے 'مارو' 'مارو' کی آوازیں آرہی تھیں۔"

ہری: "اماں! مارو مارو کون کہہ رہا تھا؟"

ماں: "بیٹا! یہ فسادی ہندو، مسلمان اور سکھ تھے جو ایک دوسرے کو کھائے جا رہے تھے۔ برے لوگ جو ایسے موقعوں کی کھوج میں رہتے ہیں ان سب نے وہ مار دھاڑ کی، بے گناہوں پر وہ ظلم توڑے کہ ساری دنیا ہمارے پاگل پن پر دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئی۔

ہری کو یہ باتیں سُن کر بہت دکھ ہوا، وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا: "اماں! ہندو مسلمانوں اور سکھوں کو ایسی بری بُری باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر باپو کو تو بڑا دکھ ہوتا ہوگا"

ماں: "ہاں بیٹا! وہ بہت کڑھتے تھے اور دکھی ہو کر بار بار کہتے 'اے بھگوان مجھ سے یہ مار پیٹ اور ظلم نہیں دیکھا جاتا اب تم مجھے اِس دُنیا سے اٹھا لو'۔"

"نواکھالی اور بہار کا جھگڑا نپٹا کر وہ پنجاب جا رہے تھے کہ دلّی میں مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ یہ تو تمھارے سامنے کی بات ہے، کیسے بھیانک دن تھے وہ، باپو دلّی پہنچے تو دل نہ مانا، یہیں رُک گئے کہ پہلے راجدھانی کو بچائیں اور اُس کے بعد آگے بڑھیں۔ یہاں اُنھوں نے دیکھا کہ لاکھوں کی گنتی میں لٹے ہوئے لوگ پنجاب سے آکر دلّی میں پھیل گئے ہیں۔ دہلی میں مار کاٹ، کہتے ہیں، انھیں چوٹ کھائے ہوئے لوگوں کی وجہ سے ہوئی۔ باپو کو ان دکھیاروں سے پوری ہمدردی تھی۔ پر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر معاملہ ایک بار دلّی سرکار کے ہاتھ سے نکل گیا تو دلّی کی آگ سارے ہندوستان کو بھسم کر دے گی۔"

ہری: "پھر باپو نے کیا کیا؟"

ماں: "باپو نے بڑی شانتی سے بیٹھ کر سوچا کہ کیا کرنا چاہئے۔ پھر اُنھوں نے دلّی کے بڑے بڑے افسروں کو بلایا اور سمجھایا کہ وہ ہندو، مسلمان سب کو ایک نگاہ سے دیکھیں اور چوکنّے اور ہوشیار ہو کر کام کریں۔ دوسری طرف شرنارتھیوں کے پاس جا کر انھیں دلاسا دیا اور سمجھایا کہ دلّی کے مسلمانوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے جن مسلمانوں نے تمھیں تمھارے گھر سے نکالا ہے اور تمھیں دکھ پہنچایا ہے، وہ اور لوگ ہیں یہ اور ہیں۔ اِن لوگوں کا بدلا تم اُن لوگوں سے نہیں لے سکتے۔ پھر مسلمانوں کو سمجھایا کہ اپنے لُٹے ہوئے پنجابی اور سندھی بھائیوں کی ہر طرح مدد کرو۔ باپو اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر بدلہ لینے کا سلسلہ چلا تو اسے روکنا کٹھن ہوگا۔ لوگوں سے

کہتے 'بھگوان کے لئے سمجھ اور صبر سے کام لو اپنے اوپر اور دوسرے پر دیا کرو۔
"جب گاندھی جی نے دیکھا کہ سچ مچ لوگوں کی مت اُلٹ گئی ہے۔ غصّے نے اُن کی عقلوں اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، تو باپو نے برت رکھا اور کہا کہ میں اپنی جان دے کر ہندو، مسلمان اور سکھ کو ایک کر کے رہوں گا" دہلی میں ان دنوں بڑی ہل چل تھی۔ لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں، اور کیا نہ کریں آخرکار سب دھرموں کے نیتا اکٹھے ہو کر باپو کے پاس پہنچے اور اُنھوں نے قسم کھائی کہ ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے پر دلّی میں جھگڑا نہ ہونے دیں گے جب گاندھی جی کو بھروسہ ہو گیا کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں وہ ضرور کریں گے تو اُنھوں نے اپنا برت کھول دیا اور دلّی کی حالت اسی دن سے سدھرنے لگی"۔

ہری: "جس دن باپو نے اپنا برت کھولا تو ماں! لوگ کتنے خوش تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دلّی میں بیاہ رچا ہوا ہے"۔

ماں: "ٹھیک کہہ رہے ہو، نیک اور اچھے لوگوں پر تو باپو کے برت کا بہت اچھا اثر تھا اور وہ پھولے نہ سماتے تھے پر ایسے لوگ بھی تھے جن کو باپو کا ہندو مسلم ایکتا کا کام ایک آنکھ نہ بھاتا تھا وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی کی یہ کوشش ہمیں کمزور کر دے گی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ بہادر بننے کے لئے لاٹھی کا جواب لاٹھی اور گولی کا جواب گولی سے دینا چاہئے۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے دینا کمزوری، اور بوداپن ہے۔ ایسے لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ جب تک باپو زندہ ہیں اور

اُن کے جسم میں سانس باقی ہے وہ ہندو، مُسلم اور سِکھ ایکتا کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہیں گے۔ باپو کے جیتے جی اِن لوگوں کی بات پر کوئی کان نہ دھرے گا۔ اس لئے لے دے کر ایسے لوگوں کے پاس ایک ہی ترکیب تھی، وہ یہ، کہ باپو کو مار ڈالیں۔

"باپو کی عادت تھی کہ رات کا کھانا وہ دن سے ہی کھا لیتے اور ٹھیک پانچ بجے پرارتھنا سبھا میں پہنچ جاتے۔ وہاں لوگ پہلے سے ان کے انتظار میں جمع رہتے تھے۔ جب باپو لوگوں کے بیچ سے جاتے تو کوئی ان کو جھک کر نمسکار کرتا، کوئی آداب کرتا اور کوئی ان کے پاؤں چھوتا۔ باپو جا کر ایک نیچے سے تخت پر بیٹھ جاتے، قرآن اور گیتا پڑھنے والے اُن کے پاس ہی بیٹھتے اور وہیں بھجن گانے والے بھی ہوتے تھے۔ پرارتھنا شروع ہوتی، تو سب سے پہلے قرآن میں سے کچھ آئتیں پڑھی جاتیں۔ پھر گیتا کا پاٹھ ہوتا۔ بھجن گائے جاتے آخر میں باپو، لوگوں کو اُپدیش دیتے۔ اُس وقت کی حالت اور اونچ نیچ سمجھاتے۔ پرارتھنا سبھا میں ایک بھجن ضرور گایا جاتا تھا جو باپو کو بہت پسند تھا۔



ایشور اللہ تیرے نام
سب کو سمّتی دے بھگوان

اِسی طرح اور بھی کئی بھجن تھے جو اُن کی پرارتھنا سبھا میں گائے جاتے تھے۔

"گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں دُور دُور سے لوگ آتے اور سب ہندو اور مسلمان، اچھوت اور برہمن ایک ہی جگہ بیٹھ کر اپنے خدا کو یاد کرتے۔"

ہری: "ہاں! پرارتھنا سبھا میں تو میں بھی گیا تھا۔ میں جانتا ہوں وہاں کیا کیا ہوتا تھا۔ پر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ باپو گیتا کے ساتھ ساتھ قرآن اور بائبل کیوں پڑھواتے تھے؟"

ماں: "بیٹا! باپو کہتے تھے کہ سب دھرم سچّے ہیں اور سب دھرموں کی کتابیں بھگوان کی بھیجی ہوئی ہیں اور سب سچّائی کا راستہ بتاتی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ میں ہندو بھی ہوں اور مسلمان بھی ہوں، سکھ بھی ہوں اور عیسائی بھی۔ یہ سب میرے مذہب ہیں۔ کیونکہ سب مذہبوں کی جڑ نیکی اور سچّائی ہے۔

"ہاں تو میں تمھیں آج کی بات سُنا رہی تھی۔ باپو جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے پرارتھنا سبھا میں پہنچے کیونکہ آج انھیں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ ابھی وہ بھیڑ میں سے گزر ہی رہے تھے کہ ایک نردئی پاؤں چھونے کے بہانے سے آگے بڑھا اور اس نے باپو کو گولیوں کا نشانہ بنا کر مار ڈالا۔ کیسا پتّھر کا دِل ہو گا اُس پاپی کا جس کا ہاتھ باپو پر اُٹھ سکا۔

"ارے تم رو رہے ہو ہری! صبر کرو، گاندھی جی نے بھگوان کی راہ میں اپنی جان دی ہے۔ ایسے لوگ مرتے نہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ آخر میں جیت انھیں کی ہوگی۔ باپو کی جیت سچ کی جیت ہے اور سچ کی جیت ہندوستان کی جیت، پر اس کے لئے بچوں اور بوڑھوں، عورتوں اور مردوں، سب کو ان تھک کام کرنا چاہیئے۔

"ہمیں گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے پر صرف آپ ہی نہیں چلنا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی چلانا ہے۔ یہ وہی راستہ ہے جو تیس برس سے گاندھی جی ہمیں دکھا رہے تھے۔ یہ سچ، پریم اور اہنسا کا راستہ ہے۔ جو لوگ بھٹک کر جھوٹ نفرت اور ہنسا کی پگ ڈنڈیوں پر پڑ چکے ہیں اُن لوگوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر ٹھیک راستے پر لانا ہے۔

"ہمیں یہ کبھی نہیں سوچنا چاہیئے کہ ہم صرف ہندو، مسلمان، سکھ یا عیسائی ہیں۔ بلکہ سدا یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم ہندوستانی ہیں اور سچے ہندوستانی۔ ہمیں سب کو ہندو مسلم ایکتا کے لئے کام کرنا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو یہ سبق دینا ہے کہ سب جاتیاں ایک ہیں۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان، کیا سکھ سب کو بھگوان نے بنایا ہے اور سب کو آپس میں پریم سے رہنا ہے۔"

ہری: "اماں! سچا ہندوستانی بننے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

ماں: "بیٹا! اس کے لئے ہمیں باپو کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہے۔ ہمیں ہندوستان

کو ایسا دیس بنانا ہے جہاں غریبی اور دُکھ نہ ہو۔ جہاں زبردست کا ٹھینگا کمزور کے سر پر نہ ہو، جہاں امیر غریب اور ہندو مسلمان کا سوال نہ ہو، سب برابر ہوں، کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے۔ سب لوگ پڑھے لکھے اور خوش ہوں۔ پران چیزوں کو پانے کے لئے سچائی، قربانی، تیاگ اور محنت ضروری ہیں۔ ہم سب اس کام میں لگ جائیں تو باپو کی آتما کو بہت شانتی ملے گی۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بار ہماری محنت پھل ہی لائے۔ پر اس سے نراس ہو کر کندھا ڈال دینا باپو کے چیلوں کا کام نہیں۔ اُن کے سچّے چیلے تو نتیجے کی پرواہ کئے بِنا، دن رات نیک کام کرنے کی دُھن میں لگے رہتے ہیں اور یہی اصلی سیوا ہے۔"

ماتا جی ابھی گاندھی بابا کی کہانی سنا رہی تھیں کہ دادا جی ریڈیو پر پنڈت جواہر لال اور سردار پٹیل کی تقریر سُن کر آئے اور کہنے لگے۔

"بچارے پنڈت جی پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں اُنھوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں ریڈیو پر کہا: "دوستو اور ساتھیو! روشنی گل ہو گئی اور ہماری زندگیوں پر اندھیرا چھا گیا۔ میں تم سے کیا کہوں اور کیسے کہوں کہ ہمارا نیتا، ہمارا باپو اور اس دیس کا باپ چل بسا۔ دیس میں زہر پھیلا ہوا ہے۔ اور اسی زہر نے لوگوں کے دماغوں میں بِس بھر دیا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم شانتی اور ہمّت کے ساتھ اس بِس کے پیڑ کو اکھاڑ پھینکیں۔ ہمیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا ہے۔ مگر اسی ڈھب سے جو ہمارے باپو نے ہمیں سکھایا ہے۔ کل کا سارا

دن برت اور پرارتھنا میں بِتانا چاہیئے۔ کل چار بجے گاندھی جی کی چِتا جلائی جائے گی۔ آؤ، ہم سب اپنے باپو کی طرح اپنے جیون کو اس دیس کے لئے تج دیں۔"

اس کے بعد سردار پٹیل بولے، ان پر بھی گاندھی جی کی موت کا بڑا اثر تھا انھوں نے کہا "میں تم سے کیا کہوں کیا ہوا، پر جو کچھ ہوا وہ بڑے دکھ اور شرم کی بات ہے۔ گاندھی جی کچھ دنوں سے دیس کی حالت سے مطمئن نہ تھے۔ اسی لئے انھوں نے برت رکھا تھا۔ اب جو کچھ بھی ہوا ہمیں اس کا رنج تو ضرور کرنا چاہیئے پر غصہ نہیں۔ غصے میں یہ ڈر ہے کہ کہیں اُن کا دیا ہوا اپدیش بھول نہ جائیں آؤ، ہم وہ کر دکھائیں جو ہم سے باپو کی زندگی میں نہ ہو سکا۔ نہیں تو ہمارے ناموں پر یہ دھبّہ لگ جائے گا کہ ہم باپو کی نصیحت پر عمل نہ کر سکے۔ آج کا دُکھ بھرا واقعہ خدا کرے ہمارے نوجوانوں کو جگا کر انھیں ان کا اصلی دھرم اور فرض سمجھا سکے۔ دل چھوڑنے کی بات نہیں۔ ہمیں مِل کر گاندھی جی کے شروع کئے ہوئے کام کو ختم کرنا ہے۔"

"تم رو رہی ہو ہری کی ماں!" دادا جی بولے: "رونے سے کوئی کام سپھل نہیں ہوتا، یہ رونے اور سر دھننے کا وقت نہیں۔ اس گھڑی سب ہندوستانی سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں اور گاندھی جی کے دشمنوں سے کہیں آؤ ہم ہیں باپو کی نشانی، ہم ہیں اُن کے سپاہی، آؤ میدان میں اُترو، ہم سچائی کا جھنڈا، اہنسا کی ڈھال اور آتمک شکتی کی تلوار لے کر



خون بہائے بنا میدان جیتیں گے۔ ہماری جیت
اٹل ہے۔

"آؤ ہم سب ہندوستانی اٹھیں اپنے آنسو
پونچھ ڈالیں، اور نئی امیدوں کے ساتھ آگے بڑھیں،
آؤ ہم باپو کی دی ہوئی شکتی اور جلال سے کام لیں
اور سنسار کو سچائی کی جنگ جیت کر دکھا دیں اور دنیا
کو بتا دیں کہ باپو کیا تھے اور کیا چاہتے تھے۔"





۲۔ راج کوٹ میں اُن کا مدرسہ۔



۳۔ بمبئی جہاں ۱۹۲۱ء میں اہنسا کا سبق دیا۔



۴۔ چمپارن میں کسان ستیہ گرہ کی گئی۔



۵۔ سابرمتی جیل میں مہاتما جی قید رہے۔



